شاہ وَجیہہ الدین علوی گجراتیؒ

احوال و آثار



مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

انجمنِ اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

شاہ وَجیہہ الدین علوی گجراتیؒ

احوال و آثار

مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

پیش لفظ

پروفیسر عبدالستار دلوی

(ڈائرکٹر، انجمنِ اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ)

ناشر

انجمنِ اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پبلی کیشن سیریز (جدید) : ۵

کتاب کا نام	:	شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتیؒ : احوال وآثار
مصنف	:	مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی
ناشر	:	انجمنِ اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی
سالِ اشاعت	:	اپریل ۲۰۱۵ء
تعدادِ اشاعت	:	۵۰۰
کمپوزنگ وسرورق	:	مدنی گرافکس، ۳۰۵-سوموار پیٹھ، پونے-۱۱
صفحات	:	۱۷۶
قیمت	:	۲۰۰/ روپے

ملنے کے پتے : ۱۔ انجمنِ اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، 92، دادابھائی نوروجی روڈ،
ممبئی-001 400- فون:022-22651353
۲۔ نئی کتاب، جامعہ ملیہ، دہلی-025 110-فون: 65416661
۳۔ مکتبہ جامعہ، پرنس بلڈنگ، جے جے اسپتال، ممبئی۔ 23774857

SHAH WAJEEHUDDIN ALAVI GUJARATI

Life and Works

by

Maulana Abdur Rehman Parwaaz Islahi

Published by

Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute, Mumbai - 1

2015 Price: Rs. 200

فہرست

عجب نہیں کہ مُسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہَ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ
(اقبالؒ)

اپنی بات

ڈاکٹر ظہیر قاضی

انجمنِ اسلام مسلمانانِ ممبئی کا ممتاز تعلیمی ادارہ ہے جو جسٹس بدرالدین طیب جی اور ناخدا محمد علی روگھے (دوم) کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ یہ ادارہ ۱۸۷۴ء میں قائم کیا گیا۔ اس کا بنیادی مقصد مسلمانانِ ممبئی میں ثانوی تعلیم کا فروغ تھا۔ اس کے ابتدائی زمانے میں جو بزرگ اس سے متعلق و منسلک تھے ان میں جسٹس بدرالدین طیب جی اور ناخدا محمد علی روگھے کے علاوہ منشی غلام محمد اور محی الدین دلوی (اوّلین دو سکریٹری)، قمرالدین طیب جی اور عبداللہ دھرمسی کے نام بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں عبداللہ دھرمسی کے زمانے میں، جب وہ انجمنِ اسلام کے سکریٹری تھے، انجمنِ اسلام ہائی اسکول کی عالی شان عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ پرشکوہ عمارت اپنے اسلاف کی انتھک کوششوں اور تعلیمی مقصد سے لگن کی ایک مثالی یادگار ہے جسے ممبئی میں Heritage Building ہونے کا شرف حاصل ہے۔

انجمنِ اسلام نے اپنی شاندار تاریخی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بعد کے زمانے میں بھی اسے قائم رکھا اور عصری ضروریات کے ساتھ اپنے کاموں میں توسیع کی۔ لڑکوں کی تعلیم کے

ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی توجہ کی، پھر اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا جو مسلمانوں کی لسانی، ادبی اور تہذیبی شناخت کی ایک علامت ہے۔ اس سلسلے میں انجمن اسلام کے سابق صدر جناب سیف طیب جی اور ان کے رفقاء ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار اور پروفیسر آصف اے۔ اے۔ اے۔ فیضی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

ماضی میں ادارے کے ڈائرکٹر پروفیسر نجیب اشرف ندوی ، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور ادارے کے رفیق جناب عبدالرزاق قریشی کی اعلیٰ تحقیقی کاوشیں علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے کا شرف انجمنِ اسلام کو حاصل رہا ہے، جس کی علمی دنیا نے بڑی پذیرائی کی۔ یہ کتابیں حوالہ جاتی کتابوں کے طور پر مختلف یونیورسٹیوں میں شاملِ نصاب رہی ہیں۔

اس سے قبل ہم نے ادارہ کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر عبدالستار دلوی کی مرتبہ کتاب 'مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار' پیش کی تھی۔ اب انجمن اسلام کے تحت چلنے والے احمد سیلر ہائی اسکول کے اُردو، عربی کے سابق استاد مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی صاحب کی تحقیقی کاوش کو پیش کرتے ہوئے ہمیں بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی صاحب نے کتاب ہٰذا کی اشاعت میں خصوصی کردار ادا کیا ہے جس کے لیے ادارہ ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ انجمنِ اسلام آئندہ بھی علمی، تحقیقی اور ادبی شہ پارے پیش کرتا رہے گا۔

ممبئی

ظہیر قاضی
صدر، انجمنِ اسلام، ممبئی

پیش لفظ

پروفیسر عبدالستار دلوی

تصوف، مشرقی زبانوں خصوصاً فارسی اور اُردو شاعری میں ایک معروف اور مقبول موضوع رہا ہے۔ تصوف کے تعلق سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ 'صوف' سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں: بکری کے بال۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ 'صفہ' سے ماخوذ ہے جس کے معنی چبوترہ ہے اور صحابہؓ اس چبوترے پر بیٹھ کر رسول خداؐ کے ارشادات سنتے تھے اور اس سے ان کی تعلیم ہوتی تھی۔ انھی لوگوں کو 'اصحاب صفہ' کہتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور سے دنیاوی معاملات سے دور رہتے تھے۔ تصوف کے تعلق سے اور بھی کئی نظریات ہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ اس کا مفہوم ذہن و دل کو حرص و ہوس سے پاک رکھنا اور خدا سے، جو حقیقتِ کل ہے، اس سے اپنے آپ کو قریب کرنا ہے۔ ہندوستان میں تصوف بہت پھلا اور پھولا اور اس کے کئی اسکول پیدا ہوئے، جن میں چشتیہ، شطاریہ، قادریہ، سہروردیہ جیسے سلسلے ہیں۔ دلّی میں نظام الدین اولیاءؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، شرف الدین بوعلی قلندرؒ اور فرید الدین شکر گنج جیسی برگزیدہ شخصیتیں پیغامِ محبت عام کرتی رہی ہیں۔ بقول ڈاکٹر شاہ ظہور الحسن شارب:

’’گجرات میں تصوف اجنبی کی طرح آیا، حاکم کی طرح رہا اور تسخیرِ
قلوب کر کے لازوال سلطنت چھوڑ گیا۔‘‘

گجرات میں تصوف کو جس شہر میں پروان چڑھنے کے مواقع حاصل ہوئے وہ گجرات کا شہر نہروالا تھا جسے اب پٹن کہا جاتا ہے۔ یہ شہر ہندو راجاؤں کا دارالخلافت تھا۔ احمد آباد کی بنیاد پڑنے کے بعد اس شہر کی شہرت و اہمیت کم ہو گئی اور احمد آباد کی شہرت بڑھی۔ صوفیاء کی تعلیمات جو انسان دوستی، بھائی چارہ، یکجہتی کی تعلیمات پر مشتمل تھیں، ان تعلیمات نے سماج کی نچلی اور پسماندہ ذاتوں کو متاثر کر کے اپنے دائرۂ اثر میں لے لیا۔ ہندوستان میں صوفیاء کا ایک لسانی اور ادبی کردار بھی رہا ہے۔ انھوں نے اُردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک بنیادی رول ادا کیا ہے۔ صوفیاء کے ملفوظات ہی سے اُردو زبان کے ابتدائی نقوش ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مشہور رسالے ’اُردو زبان کے ارتقاء میں صوفیائے کرام کا کام‘‘ میں اس کی تفصیلات دی ہیں۔ گجرات کے صوفیاء میں یوں تو بے شمار صوفیاء کا ذکر موجود ہے تاہم حضرت پیر محمد شاہ، حضرت شاہ عالم، حضرت قطب عالم، حضرت شیخ رکن الدین مجذوب، حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی، شیخ احمد کھٹو، حضرت قاضی محمود دریائی اور حضرت خوب محمد چشتی رحمتہ اللہ علیہم کے نام بہت شہرت رکھتے ہیں۔ ان صوفیاء سے منسوب اُردو کے ملفوظات تاریخ کے صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں گجرات میں تصوف کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں ہے لیکن اس سلسلے میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان صوفیاء کی بدولت گجرات اور قرب و جوار میں اسلامی تعلیمات کا فروغ ہوا۔ ان صوفیاء کے حالات قدیم فارسی تذکروں میں بکھرے ہوئے ہیں جنھیں منضبط کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا یہ علمی و روحانی ورثہ دست بُردِ زمانہ سے بچ جائے جن کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام کی برگزیدگی اور اعلیٰ انسانی قدروں کو وسعت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں گجرات کے چند صوفیاء اُردو زبان و ادب کے حوالے سے بطورِ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں حضرت خوب محمد چشتیؒ، شیخ بہاؤ الدین باجنؒ، علی جیو گام دھنیؒ، حضرت قاضی محمودؒ دریائی اور شاہ

وجیہہ الدین علویؒ کے نام امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرت خوب محمد چشتیؒ کی مشہور صوفیانہ تصنیف ’خوب ترنگ‘ اور اس کی شرح ’امواج خوبی‘ ہے جس پر ڈاکٹر عبدالحمید فاروقی نے گراں قدر کام کیا ہے اور اسی طرح میرے محترم استاد ڈاکٹر عالی جعفری نے اسے مرتب کیا۔ قاضی محمود دریائی کا کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔ شاہ وجیہہ الدین علوی کی کوئی مستقل تصنیف یا صنفِ ادب کے حوالے سے کوئی تخلیق نہیں پائی جاتی سوائے چند رسائل اور شرحوں کے۔ ’بحر الحقائق‘ کے نام سے ان کے ملفوظات پائے جاتے ہیں۔ بحر الحقائق کا ایک نسخہ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کے کتب خانے میں محفوظ تھا جو انجمن ترقی اُردو، کراچی (پاکستان) میں محفوظ ہے۔ یہ فی الوقت ہماری دسترس میں نہیں ہے، تاہم کتاب ہٰذا شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے اس کا دوسرا نسخہ حیدرآباد سے ڈھونڈ نکالا۔ یہ ملفوظات اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء کی کہانی سناتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اور اہم تصنیف حضرت علی جیو گام دھنی کی ’جواہرِ اسرار اللہ‘ ہے جو گجری اُردو کی ایک قدیم ترین تصنیف ہے۔ زبان کی قدامت کے لحاظ سے اس کی ترتیب و تدوین ایک مشکل کام ہے تاہم یہ کسی ایسے اسکالر کی توجہ کی مستحق ہے جو متنی تنقید کا شیدا بھی ہو اور قدیم زبانوں اور مختلف پراکرتوں پر بھی نظر رکھتا ہو۔ یہ گجری اُردو ادب کے محقق کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

گجرات، اُردو زبان کی اور تصوف و عرفان کی ایک زرخیز زمین ہے۔ یہ اُردو کے علمی حلقوں کی توجہ چاہتی ہے۔ یہاں پر ایسے نوادر اور علمی ہیرے اور جواہرات موجود ہیں جو ہماری تاریخِ ادب کو آب و تاب دے سکتے ہیں۔ یہ ساری منظومات یا ادب پارے اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں بنیاد کا پتھر ہیں اور ان پر دل جمعی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا، حضرت خوب محمد چشتیؒ پر ڈاکٹر عالی جعفری (مرحوم) کام کر چکے ہیں اور یہ کتاب گجرات کی پیر محمد شاہ لائبریری سے شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحمید فاروقی کا کام ابھی غالباً شائع نہیں ہوا لیکن بہاؤ الدین باجن کی ’خزانۂ رحمت / خزینۂ رحمت‘ ڈاکٹر شیخ فرید مرتب کر چکے

ہیں۔ انھی صوفیاء میں ایک اہم نام شاہ وجیہہ الدین گجراتیؒ کا بھی ہے جو توجہ طلب تھا۔ شاہ وجیہہ الدین علویؒ کی شخصیت بحیثیت صوفی کے مسلّم ہے لیکن ان کے حالاتِ زندگی اور ان کے افکار پر صرف مختلف تذکروں میں جستہ جستہ معلومات ملتی تھیں۔ انھوں نے اپنی صوفیانہ تبلیغی جوئے رواں کے لیے اُردو کا استعمال کیا۔ ان کے یہ ملفوظات 'بحر الحقائق' میں محفوظ ہیں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ لسانیات کے طالبِ علم کی حیثیت سے میری بنیادی دلچسپی ان ہی ملفوظات سے تھی۔ لہٰذا میں نے اپنے بزرگ اور کرم فرما مولانا عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی صاحب سے یہ گزارش کی تھی کہ حضرت مخدوم علی مہائمیؒ کے احوال و آثار کے بعد وہ شاہ وجیہہ الدین علوی کی حیات، صوفیانہ تعلیمات اور ملفوظات کی روشنی میں تحقیق کریں۔ مولانا پرواز صاحب سے گفتگو میں اکثر اس بات کا بھی ذکر رہتا تھا کہ پیر محمد شاہ لائبریری کے قدیم مخطوطات پر مخدوم علی مہائمی صاحبؒ کے بارے میں معلومات شاہ وجیہہ الدین گجراتیؒ کی محرّرہ ہیں۔ لہٰذا میں نے ان سے گزارش کی کہ وہ شاہ وجیہہ الدین علویؒ کی بابرکات شخصیت پر ایک کتاب تصنیف کریں اور اس میں ان کے اُردو ملفوظات بھی محفوظ ہوں۔ اتفاق سے اس پروجیکٹ پر کام کرنے کے سلسلے میں ان کا حیدرآباد جانا ہوا جہاں آصفیہ لائبریری، سینٹرل لائبریری، سالار جنگ لائبریری وغیرہ میں قیمتی و علمی ذخیرے موجود ہیں۔ چنانچہ دورانِ تحقیق انھیں ایک بیاض میں 'بحر الحقائق' کا بھی ایک مخطوطہ ملا جس کو انھوں نے اوّلاً ایک مضمون کی صورت میں مجھے عنایت فرمایا۔ یہ مقالہ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر اور لائبریری (ہندوستانی پرچار سبھا) کے رسالے 'ہندوستانی زبان' میں شائع ہو چکا ہے۔ مولانا پرواز صاحب نے اس کے بعد شاہ وجیہہ الدین گجراتی پر اپنی تصنیف مکمل کر کے میرے حوالے کی تھی۔ یہ تیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔

مولانا پرواز اصلاحی صاحب اس زمانے میں انجمن اسلام کے احمد سیلر ہائی اسکول میں اُردو، عربی کے استاد کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے تھے اور مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر میں جز وقتی ریسرچ فیلو بھی تھے۔ انھوں نے حیدرآباد کے علاوہ ممبئی کے کتب خانوں

کی بھی علمی سیر کی اور خصوصاً انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ذخیرۂ کتب سے بھی استفادہ کیا۔ اور اس طرح ان کی یہ تصنیف مکمل ہوگئی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انجمن اسلام کے اساتذۂ اُردو میں وہ بحیثیت محقق واحد شخص تھے جنھوں نے اُردو میں اعلیٰ تحقیقی کام کو آگے بڑھایا۔ وہ تحقیق کے مردِ میدان تھے۔ اگر انھیں مرحوم عبد الرزاق قریشی کی طرح اُردو کے تحقیقی ادارے میں کام کرنے کا موقع ملا ہوتا تو وہ غیر معمولی تحقیقی خدمات انجام دے سکتے تھے۔ اس کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ انھوں نے جو تحقیقی خدمات انجام دی ہیں وہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ مخدوم علی مہائمیؒ سے پہلے انھوں نے مومن خان مومنؔ پر بھی ایک کتاب احسان دانش کے اشتراک سے شائع کی تھی اور اسی طرح اپنے قیامِ ممبئی کے دوران انھوں نے ممتاز اُردو شاعر اور معاصرِ غالبؔ مفتی صدر الدین آزردہ پر بھی گراں قدر تحقیقی کام انجام دیا تھا۔ حضرت شاہ وجیہہ الدین گجراتی پر ان کی پیش نظر کتاب پرواز صاحب کی علمی اور تحقیقی فتوحات کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جسے تاخیر سے سہی، انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اُردو کے علمی حلقوں کی نذر کر رہا ہے۔

آخر میں مَیں اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ شاہ وجیہہ الدین علویؒ کی شخصیت کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اُردو کے پہلے عظیم شاعر ولیؔ دکنی کا تعلق بھی شاہ وجیہہ الدینؒ کے خانوادے سے ہے اور ہمارے ممتاز نقاد مرحوم وارث علوی کا تعلق بھی شاہ وجیہہ الدینؒ ہی کے سلسلے سے ہے۔ گجرات میں اُردو کے سلسلے میں ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا عالمانہ مقالہ 'سخنورانِ گجرات' بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے گجرات میں اُردو کے عہد بہ عہد ارتقا کی داستان سنائی ہے۔ شاہ وجیہہ الدین علویؒ، خوب محمد چشتیؒ، علی جیو گام دھنیؒ اور خزانۂ رحمت کا اس کتاب میں ذکر محفوظ ہے اور اس سے گجرات میں اُردو زبان و ادب کے ارتقاء کی داستان جستہ بہ جستہ محفوظ ہوگئی ہے۔

عبد الرحمٰن پرواز صاحب کی پیش نظر کتاب 'شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی: احوال و آثار'

اس سلسلے میں استناد کا درجہ رکھتی ہے جو ان کی محنت شاقہ اور بلند علمی و تحقیقی ذوق کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ انجمنِ اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اس کتاب کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے۔ میں اس پیش کش کے لیے انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی اور دیگر اراکینِ منتظمہ کا بھی شکرگزار ہوں جن کی علم پروری کی وجہ سے یہ کتاب اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی کتابوں کی سلسلۂ جدید کے تحت شائع ہورہی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں احمد آباد اور ممبئی کی ممتاز شخصیت اور فنِ تعمیر کے عالمی شہرت یافتہ اور علم دوست اور علم نواز جناب افتخار قادری (I.M. Qadri)، سیکریٹری نہرو سینٹر، ممبئی کی خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ اسی طرح پونے کے میرے علم دوست جناب صالح محمد خان کا بھی مالی تعاون حاصل رہا۔ میں ان دونوں کا ان کی اس علم نوازی کے لیے شکرگزار ہوں۔

میں، ڈاکٹر سعیدہ پٹیل، اسسٹنٹ ڈائرکٹر انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور جناب سیّد طاہر عباس، لائبریرین انسٹی ٹیوٹ کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے پروف ریڈنگ اور کتاب کی طباعت کے کئی دیگر مراحل میں میرا ساتھ دیا۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب علمی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

ممبئی
جنوری ۲۰۱۵ء

پروفیسر عبدالستار دلوی
ڈائرکٹر، انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
ممبئی

حالاتِ زندگی

شاہانِ گجرات کی حکومت تقریباً دو سو برس تک رہی۔ ان میں بڑے بڑے اولوالعزم اور بیدار مغز فرمانروا پیدا ہوئے، جنھوں نے بڑی عظمت اور شان حاصل کی۔ وہ مذہب کے دلدادہ بھی تھے اور علم وفن کے قدرداں بھی۔ جہاں ان کے دورِ حکمرانی میں گجرات صنعت و حرفت، تجارت و زراعت، آئین و دستور اور اصلاحاتِ ملکی کے اعتبار سے تہذیب و ثقافت کا مرکز بن گیا وہاں ان کی علمی قدردانی اور سرپرستی کی بدولت شیراز، اصفہان، گاذرون، استرآباد، طارم، یمن اور مصر و حجاز کے جید اور برگزیدہ علماء و فضلاء نے آکر گجرات میں بود و باش اختیار کی، جن کے فیوض سے تھوڑے عرصے میں گجرات گہوارۂ علم وفن بن گیا۔ اور یہاں کی خاک سے ایسے ایسے علماء اور اربابِ کمال پیدا ہوئے جن کے فیض سے پورا ہندوستان سیراب ہوا۔

ان ہی عظیم المرتبت اور باکمال ہستیوں میں حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کی ذاتِ گرامی بھی ہے جن کی بدولت علمی دنیا میں نیا انقلاب آیا۔ تشنگانِ علم کی جس بڑی تعداد نے ان سے سیرابی حاصل کی شاید ہی کوئی دوسری ذات ان کی مدمقابل نکلے۔ شاہ وجیہہ الدین کا علمی اور روحانی فیضان مدرسہ اور خانقاہ کی شکل میں صدیوں رہا۔ گجرات کے آسمان پر ان کے علمی کارناموں کی شعاعیں ابھی تک پرتوفگن ہیں۔

نام ونسب :

شاہ صاحب کا اصلی نام سیّد احمد ہے مگر دنیا ان کو وجیہہ الدین کے نام سے جانتی ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: وجیہہ الدین احمد بن قاضی سیّد نصر اللہ بن قاضی سیّد عماد الدین بن قاضی سیّد عطاء الدین بن قاضی سیّد معین الدین بن سیّد بہاء الدین بن سیّد کبیر الدین۔ اس طرح سلسلہ سیّدنا امام محمد تقی تک پہنچتا ہے[1]۔

سیّد کبیر الدین صاحب کا اصلی وطن یمن تھا لیکن مکہ معظمہ میں آ کر مقیم ہو گئے اور اسی لحاظ سے بعض لوگوں نے ان کو مکی بھی تحریر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ سیّد بہاء الدین ایک دن خانۂ کعبہ میں معتکف تھے کہ ان کو بذریعہ کشف ایسا معلوم ہوا کہ سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہند کے صوبۂ گجرات میں جا کر خلقِ خدا کی ہدایت کرو۔ چنانچہ آٹھویں صدی ہجری کے آخر یا نویں صدی ہجری کی ابتدا میں سلطان مظفر اوّل کے عہد میں تشریف لائے اور مقام پاٹری ضلع جھالاوار (بیرم گام) میں سکونت اختیار کی اور ہدایتِ خلق میں مشغول ہو گئے۔ شاہانِ گجرات نے آپ کی بڑی عزت کی۔ ہمیشہ آپ کا خیال رکھتے تھے۔ اسی جگہ آپ نے شادی کی اور آپ کے بچے پیدا ہوئے اور اسی جگہ آپ کا انتقال ہوا۔

ان کے بعد ان کے جانشین ان کے لڑکے سیّد معین الدین کا دور آیا تو محکمۂ قضا ان کے سپرد ہوا۔ اور پھر ان کے لڑکے قاضی سیّد عطاء الدین موسوم بہ قاضی عطاء الملک اور پوتے قاضی سیّد عماد الدین نے اس محکمے کو سنبھالا اور مختلف ضلعوں میں بحیثیت قاضی کام انجام دیتے رہے۔

والد ماجد :

شاہ وجیہہ الدین کے والد ماجد قاضی نصر اللہ سلطان محمود بیگڑھ کے آخری زمانے میں بمقام چانپانیر قاضی کے عہدے پر سرفراز کیے گئے۔ قاضی نصر اللہ ممتاز عالمِ دین تھے اور فقہی علوم میں خصوصیت کے ساتھ دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ سلطان مظفر حلیم جو خود بڑا عالم اور دیندار فرمانروا

[1]: مرآۃ احمدی میں ہے کہ آپ کے خاندانی لوگ سلسلۂ نسب محمد عریض بن محمد الجواد تک لے جاتے ہیں۔ اس کی تفصیلات مجموعۂ حالات شاہ وجیہہ الدین مرتب محمد یوسف کٹ کٹے میں بھی درج ہے اور ایک منظوم شجرۂ نسب میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔

تھا، قاضی نصر اللہ سے بہت خوش تھا۔ ان کو اپنے ساتھ احمد آباد لایا اور اپنے محل کے پاس اقامت کے لیے جگہ دی۔ یہ وہ مقام ہے جسے آج کل خانقاہ یادگاہ شاہ وجیہہ الدین کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ قاضی نصر اللہ باوجودیکہ نہایت محتاط اور مشتبہ امور سے پرہیز کرتے تھے لیکن عمر بھر نہایت خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ اللہ تعالیٰ نے سات فرزند عطا کیے جن میں شاہ وجیہہ الدین اور قاضی برہان الدین نے بڑا رتبہ حاصل کیا۔

قاضی نصر اللہ نے سلطان محمود ثالث کے عہد میں وفات پائی۔ آپ کی وفات کا مادۂ تاریخ "لَهٗ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا" (۹۵۸ھ) ہے۔

ولادت :

حضرت شاہ وجیہہ الدین کی پیدائش ۲۲ محرم ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۴ء چمپانیر[1] (چانپانیر) میں ہوئی۔ لفظ "شیخ" سے ان کی ولادت کی تاریخ نکلتی ہے۔ تقریباً سات آٹھ برس تک آپ چمپانیر میں مقیم رہے۔ اس کے بعد آپ کے والد قاضی نصر اللہ سلطان مظفر حلیم کے زمانے میں احمد آباد میں منتقل ہو کر آ گئے تو آپ کی نشو و نما اور اُٹھان احمد آباد ہی کی فضا میں ہوئی۔

[1]: چمپانیر احمد آباد کے جنوب مشرق کی جانب تقریباً ۷۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ سلطان محمود بیگڑھ ۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء میں اسی کے قریب قلعہ پاواگڑھ کو فتح کر لینے کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ فتح کرتے ہی شہر کے ارد گرد ایک فصیل بنوائی جس میں برج اور پھاٹک تھے۔ اس نے ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا اور اس کا نام چمپانیر کی بجائے محمود آباد رکھا اور ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء میں اس کی وفات تک یہ اس کی محبوب سکونت گاہ تھا۔ ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء تک جب بہادر شاہ کا انتقال ہوا یہ شہر گجرات کا سیاسی مرکز رہا۔ ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں جب گجرات مغلوں کے قبضے میں آیا تو چمپانیر اس وقت نو محلات کی ایک سرکار کا صدر مقام تھا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ شہر مرہٹوں کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۸۵۳ء میں اس کو انگریزوں نے فتح کر لیا۔ چونکہ یہ شہر اس وقت ویران ہو چکا تھا اس لیے دوبارہ آباد نہیں کیا گیا۔ اس شہر کی یادگار عمارتوں میں سات منزلہ محل ہے جس کی اب صرف نچلی منزل باقی رہ گئی ہے۔ اس محل کو پاواگڑھ کے بالمقام چٹان کے سرے پر تعمیر کرایا تھا۔ شہر پناہ کے علاوہ باقی سب مسجدیں اور مقبرے ہیں جس کا طرزِ تعمیر مقامی ہے۔ جامع مسجد ۹۲۹ھ/۱۵۲۳ء کی تعمیر ہے جس کا خاکہ اس سے سو سال پہلے کی بنی ہوئی احمد آباد کی جامع مسجد سے لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دس اور مسجدیں ہیں جن میں نگینہ مسجد اور سدی سید کی مسجدیں بھی ہیں اور کئی گمنام مقبرے ہیں۔ آج کل یہ شہر بالکل کھنڈر بن چکا ہے۔ (اسلامی انسائیکلوپیڈیا نمبر ۱۵۔ صفحہ: ۱۹۷ و ۲۰۷)

تعلیم و تربیت :

قدرت نے ابتدا ہی سے آپ کو نیک طینت، صالح اور ہونہار بنایا تھا۔ ذہانت اور ذکاوت سے نوازا تھا۔ حافظہ اور قوتِ یادداشت بلا کی پائی تھی۔ چنانچہ سات سال کی عمر میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کرلیا تھا اور آٹھویں سال تجوید کے ساتھ قرآن پاک علماء کے سامنے سنایا۔ لوگ ان کی غیر معمولی صلاحیت پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس کے بعد علومِ متداولہ کی تحصیل میں مشغول ہوئے اور اپنے چچا سیّد شمس الدین صاحب سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر اپنے ماموں سیّد ابوالقاسم صاحب سے حدیث کا درس لیا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں فنِ حدیث میں اس درجہ مہارت حاصل کرلی کہ اس زمانے کے مشہور محدث علامہ محمد بن محمد مالکی اور شیخ الحدیث حضرت ابوالبرکات بجنانی عباسی سے باقاعدہ تحصیل کرکے سندِ فراغت حاصل کی۔

علومِ عقلیہ کی طرف توجہ کی تو مولانا عمادالدین طارمی اور ابوالفضل محمد مظہرالدین گاذرونی جیسے اربابِ کمال کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور چوبیس سال کی عمر میں شاہ صاحب نے علومِ ظاہری کی تکمیل کرلی۔ سنہ فراغتِ تعلیم ''وجیہہ'' کے لفظ سے نکلتا ہے۔

ممتاز اساتذہ وشیوخ :

ذاتی صلاحیت واستعداد کے ساتھ اگر اساتذہ وشیوخ بھی اونچے درجے کے اور صاحبِ کمال ہوں تو تکمیلِ علم کی منزلیں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ جلد طے پاتی ہیں اور علوم وفنون کے نکات واسرار کے ساتھ اس کا دماغ معلومات کا گنجینہ بن جاتا ہے۔ شاہ وجیہہ الدین کی یہ خوش نصیبی تھی کہ ان کو منقولات اور معقولات دونوں میدانوں میں جو اساتذہ وشیوخ ملے وہ یگانۂ عصر اور منتخبِ روزگار تھے۔ ان میں سے ہم خصوصیت کے ساتھ چار کا مختصر طور پر تعارف کراتے ہیں۔

۱۔ علامہ وجیہہ الدین محمد بن محمد المالکیؒ :

کبار محدثین میں تھے۔ مشہور محدث علامہ شمس الدین سخاویؒ صاحبِ ضوء اللامع کے شاگردِ رشید تھے۔ گجرات میں علم حدیث کے درس واشاعت میں انھوں نے جو نمایاں خدمات انجام دیں ان کی بنا پر شاہانِ گجرات نے ان کو 'ملک المحدثین' کا خطاب دیا تھا۔ ساری عمر گجرات میں رہے۔ بڑے بڑے علماء نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ ۹۲۹ھ میں وفات

پائی[1]۔

۲۔ مولانا ابوالبرکات عبدالملک عباسی بجنانیؒ :

آپ کا شمار بھی ممتاز محدثین میں ہوتا ہے۔ ساری عمر حدیث کے فنِ شریف کی خدمت میں صرف کی۔ انھوں نے اپنے بھائی مولانا قطب الدین سے حدیث پڑھی تھی اور انھوں نے علامہ سخاویؒ سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے متعلق جو بات خصوصیت سے کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کتاب صحیح بخاری ان کو لفظاً ومعنیً یاد تھی۔ حدیث نہایت توجہ اور خشیتِ قلبی کے ساتھ پڑھاتے اور نہایت متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۹۷۰ھ میں وفات پائی[2]۔

۳۔ علامہ محمد بن محمود طارمی :

آپ شیخ عمادالدین طارمی کے نام سے مشہور ہیں۔ خراسان کے نواح طارم میں پیدا ہوئے۔ جوان ہونے کے بعد مختلف اطراف و دیار میں گئے اور ائمۂ علم وفن سے علوم کی تحصیل کی۔ ان میں سب سے اہم شخصیت محقق جلال الدین دوانیؒ کی تھی۔ مولانا طارمی چند واسطوں سے علامہ سیّد شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) سے بھی تلمذ کی نسبت رکھتے تھے۔ تحصیلِ علمی کے بعد ہندوستان کا رُخ کیا۔ اپنے کتب خانہ سمیت نہر والہ پٹن (گجرات) میں وارد ہوئے اور یہاں سکونت اختیار کی۔ علامہ عمادالدین طارمی علومِ عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے۔ خصوصاً علومِ عقلیہ کے بڑے جید استاد تھے۔ علم سیمیا وکیمیا سے بھی واقف تھے۔ تصوف کا بھی ذوق تھا۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف میں ضابطہ تہذیب کی شرح کا مخطوطہ کتب خانہ پیر محمد شاہ درگاہ میں موجود ہے۔ ان کا مدرسہ عمادیہ گجرات کی مشہور دینی درسگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ بے شمار انفاس ان سے مستفید ہوئے۔ ان کے مشہور شاگردوں قاضی علاء الدین عیسیٰ، ملا مبارک ناگوری کا نام لیا جاتا ہے۔ انھوں نے متعدد سلاطین کا عہد دیکھا۔ محمود اعظم، مظفر شاہ اور بہادر شاہ کے بعد دیگرے ان کے سامنے تخت نشین ہوئے۔ وہ حضرت ملک قطب الدین خلیفہ حضرت شاہ عالمؒ کے مرید تھے۔ گجرات میں ہمایوں کے حملہ کرنے سے پہلے وہ نہروالہ پٹن میں تھے۔ دوسری

۱: یادِ ایام مولانا سیدعبدالحئی حسنی۔
۲: یادِ ایام۔

جمادی الاولی ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء میں وفات پائی۔[1]

۴۔ علامہ ابوالفضل مظہرالدین خطیب گاذرونی :

ایران میں شیراز کے قریب گاذرون میں پیدا ہوئے۔ محقق جلال الدین دوانی اور دیگر علماء سے پڑھا اور گجرات میں آکر طرح اقامت ڈالی۔ یہ زمانہ سلطان محمود گجراتی کا تھا۔ درس و تدریس کا آغاز کیا۔ ہندوستان کی بعض اہم شخصیتوں نے آپ کی شاگردی اختیار کی۔ ملا مبارک ناگوری آپ کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔ تصانیف میں تفسیر بیضاوی پر حاشیہ ہے جو آپ نے اپنے مایہ ناز شاگرد شاہ وجیہ الدین کو املا کرایا۔ کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔[2]

انہماک علمی کا ایک دلچسپ واقعہ

علم کی جب سچی لگن پیدا ہو جاتی ہے تو آدمی کو نہ تو لہو ولعب سے دلچسپی رہتی ہے اور نہ دنیا کے کسی اور مشغلے سے لگاؤ۔ شوق مطالعہ اور انہماک علمی اسے گھریلو دلچسپیوں سے بھی بے پروا بنا دیتے ہیں۔ شاہ صاحب اپنے دور کے ان طالب علموں میں تھے جو ہمہ دم اساتذہ کی خدمت میں رہتے، ان سے استفادہ کرتے یا ان کی انیس وجلیس کتابیں رہتیں۔ شاہ صاحب کے شاگرد رشید محمد حسن منڈوی شیخ عبدالقادر بغدادی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ آپ کا جس رات میں نکاح ہوا اپنی اہلیہ کے گھر ایک مجمع کے ساتھ گئے تھے۔ ہندوستان میں ایک رواج ہے کہ داماد اور عروس کو صبح کے وقت بنا سنوار کر ایک آراستہ کیے ہوئے تخت پر بٹھاتے ہیں اور کچھ تکلفات اور تجلیات کام میں لاتے ہیں۔ آپ نے اس رسم کو پسند نہ کیا اور معینہ وقت پر مدرسہ میں چلے گئے۔ لوگ اس غرض سے کہ مقررہ رسم پوری کی جائے آپ کی ....[3]

روحانی بشارت :

شاہ صاحب خود بھی ذہین وفطین تھے اور خوش قسمتی سے اساتذہ بھی نہایت جید ملے۔ شوق مطالعہ اور کتب بینی نے صلاحیت میں چار چاند لگا دیے۔ شب و روز کی محنت و جانکاہی کے بعد

۱: ظفر الوالہ و نزہۃ الخواطر، ج:۴، و گجرات کی علمی و تمدنی تاریخ۔
۲: نزہۃ الخواطر، ج:۴۔
۳: اصل مسودہ میں یہ جملہ اسی طرح نامکمل ہے۔ عبدالستار دہلوی

معقولات اور منقولات دونوں میدانوں میں ایسا کمال پیدا کیا کہ نہ صرف احمد آباد بلکہ ہندوستان کے نہایت ممتاز علماء میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ چونکہ بچپن سے نہایت صالح اور پاکباز تھے اس لیے روحانی فیضان سے بھی بہرہ یاب ہوئے۔ خود انہی سے منقول ہے کہ "جب فقیر کے استاد مولانا عمادالدین طارمی کی وفات ہوگئی تو نہایت تاسف ہوا اور ہمیشہ اسی غم میں رہتا تھا کہ اگر ان کی زندگی اور باقی رہتی تو مزید علوم حاصل کرتا۔ اتفاقاً ایک رات حضرت رسالت پناہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں "اے فرزند! غم مت کر۔ جو علم تیرے استاد کو آتے تھے ان پر تمیں علم اور اضافہ کر کے تجھ کو عنایت کیے گئے۔" اور ایک کاغذ جس میں علوم کے نام لکھے تھے میرے ہاتھ میں دیے۔ جب میں نے اس کو دیکھا تو ان علوم کے نام تھے جو مجھ کو عنایت کیے گئے تھے۔ اس کی خوشی میں بیدار ہو گیا۔ یہ اس کی برکت تھی کہ علوم میں سے جس کی طرف متوجہ ہوتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا گویا برسوں اُس علم کا درس دے چکا ہوں۔"[1]

میلانِ تصوف :

شاہ صاحب کو تصوف سے دلچسپی ابتدائے طالب علمی ہی سے تھی۔ جب روحانی میلان بڑھا تو پہلے خود اپنے والد قاضی نصر اللہ سے چشتیہ اور مغربیہ طریقوں کو سیکھا۔ پھر اور شوق بڑھا تو کچھ دنوں حضرت شاہ قاضن چشتیؒ کی صحبت سے مستفید ہوئے۔ شاہ قاضن گجرات کے مشائخ میں شیخ علم الدین شاطبیؒ کے نقش قدم پر تھے۔ شہر پٹن میں مشیخت کی مسند آراستہ کی اور آپ سے بے شمار افراد فیضیاب ہوئے۔ شاہ قاضن کا سلسلۂ بیعت اس طرح حضرت شاہ نصیرالدین چراغ دہلویؒ تک منتہی ہوتا ہے: شاہ قاضن نے شاہ علم الدین سے، انھوں نے شیخ صدرالدین محمد شاہ راجو قتال سے، انھوں نے شیخ جلال الدین معروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے اور انھوں نے خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی سے فیض روحانی پایا۔[2]

شاہ قاضن بروز سہ شنبہ، ماہ صفر ۹۲۰ھ میں شہر پٹن میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ خان سرور تالاب پر خوابگاہ ہے۔[3]

۱: ملفوظات شاہ وجیہ الدین۔
۲: مشکوٰۃ النبوت، مصنفہ علی موسوی قلمی، باب بست وسوم۔
۳: نزہۃ الخواطر و مرآۃ احمدی۔

شاہ قاضن کے انتقال کے بعد میاں بدر الدین ابو القاسم سہروردی کی طرف متوجہ ہوئے۔ میاں ابو القاسم حضرت شاہ وجیہہ الدین کے ماموں تھے اور ''میاں بدھ'' کے لقب سے مشہور تھے۔ نہایت زاہد اور مرتاض بزرگ تھے۔ ان کا سلسلۂ بیعت اس طرح ہے:

شیخ ابو القاسم نے شیخ قطب الدین بن محمود منجھن شاہی سے اور انھوں نے حضرت شاہ عالم سے طریقۂ سہروردیہ میں خرقۂ خلافت پایا۔

اس دور کے ایک شیخ طریقت حضرت نجم الدین صدیقی بھی تھے۔ ان سے بھی مستفید ہوئے۔ انھوں نے اپنے والدِ فاضل بحرِ کامل شاہ علی خطیب سے اور انھوں نے شاہ عالم سے اور شاہ عالم نے شاہ برہان الدین قطب عالم سے استفادۂ روحانی کیا۔ بسا اوقات جب جذب و شوق کا غلبہ ہوتا تو حضرت سید کبیر الدین مجذوب سے ملاقات کرتے اور دردِ دل کی شکایت فرما کر علاج کے طالب ہوتے۔ بہرحال، تصوف اور اربابِ طریقت سے دلچسپی اور ارادت ابتدا ہی سے ان کے خمیر میں تھی۔ اور اس زمانے کے ہر مقبول سلسلہ ہائے تصوف کے اعمال و اشغال انھوں نے سیکھے اور ان کے مطابق اپنی زندگی ڈھال لی۔ بعد میں جبکہ ان کی علمی قدر و منزلت بڑھی، درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ منصبِ افتا پر فائز ہوئے تو سلسلۂ شطاریہ کے مشہور بزرگ حضرت سید محمد غوث گوالیاریؒ ۹۴۷ھ میں گجرات تشریف لائے۔ ان کے کمالاتِ روحانی کا غلغلہ بلند ہوا تو شاہ صاحب کو ملاقات کا اشتیاق ہوا۔ شاہ صاحب کے ایک مخلص اور خویش شیخ یحییٰ نامی نے جو آپ کے حقیقی ماموں تھے، شاہ محمد غوثؒ کی خدمت میں لے آئے۔ شاہ صاحب سے معانقہ و مصافحہ ہوا۔ دیکھتے ہی متاثر ہوگئے۔ چالیس روز تک ان کی صحبت میں رہے۔ سلسلۂ شطاریہ کے طریقے اور آداب سیکھے اور شاہ محمد غوث کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ ان کی جلوت و خلوت اور صحبت میں مدارج روحانی اور کمالاتِ باطنی حاصل کیے۔ اور شاہ محمد غوث سے خرقۂ خلافت پایا[1]۔

شاہ وجیہہ الدین کے شاگرد محمد حسن غوثی کہتے ہیں کہ شاہ صاحب نے ایک تقریب کا موقع نکال کر یہ ماجرا بیان کیا کہ جن مقدمات پر الٰہی حقائق کا دریافت اور کشف موقوف ہے ان

1: مجموعۂ حالات شاہ وجیہہ الدین۔

مقدمات کی تحصیل کا شوق میرے دل میں بھی اس وقت پیدا ہوا تھا کہ جب درس و تدریس میں مشغول تھا۔ ناگاہ مشیتِ ایزدی جس کی ہر ایک مقدر شئے میں سو سو نکتے اور نیرنگیاں ہیں حضرت غوث کو گوالیار سے گجرات کی طرف کھینچ لائی۔ یہ صورت مجھے حضرت غوث کی شرف پابوسی سے مشرف ہونے کا باعث ہوئی اور بہت تھوڑے عرصے میں صاحبِ ممدوح کی کیمیائی تربیت کے ذریعے میرا اسلام تانبے کی طرح کندن بن گیا۔ رسمی عقائد کی قید سے نکل کر حقیقی ایمان کی بہشت میں چہل قدمی کرنا نصیب ہوا۔ اور چند روز بعد خلافتِ مطلق کا خلعت پا کر سرفراز ہوگیا۔ اور پالیا جو کچھ پاس نہ تھا۔ اور جو کچھ پاس پھر وہ نہ ملا۔

آنچہ حق بہرِ بندگاں آراست
آرزو آنچناں نداند خواست[1]

حضرت شاہ وجیہہ الدین نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے اوّلیں پیر حضرت شاہ قاضنؒ کو خواب میں دیکھا کہ کسی درخت کے نیچے لیٹے ہوئے ہیں۔ میں بھی وہاں حاضر ہوا۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا آپ کا مرید۔ فرمایا کہ اس مرتبے پر کیسے پہنچے؟ میں نے کہا حضرت محمد غوث سے ملاقات کی بدولت۔ انھوں نے مجھے اس درجہ پر پہنچایا۔ فرمانے لگے ''شیخ محمد غوث ایسے ہی مردانِ خدا میں ہیں[2]۔''

مدرسہ علویہ کی بنیاد:

گجرات میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی تعلیمی سرگرمیاں شروع ہوگئی تھیں۔ متوسط گھرانوں میں جاہل رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہر دیندار مسلمان اپنی اولاد کو زیورِ علم سے آراستہ ضرور کرتا۔

جب راشٹ کوٹ راجاؤں کے عہد میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ بڑھی تو مسلمانوں نے گجرات میں باقاعدہ مدرسے قائم کرنے شروع کردیے۔ لیکن یہ مدرسے ابتدائی اور مخصوص تھے۔ دہلی کے مسلمان بادشاہوں کا اقتدار قائم ہوا تو حوصلے اور بڑھے اور تعلیمی معیار بھی بلند ہوا۔ باہر

1: گلزارِ ابرار۔
2: ملفوظاتِ شاہ وجیہہ الدین۔

کے ملکوں اور علاقوں سے علماء وفضلاء کی اچھی خاصی تعداد آ گئی۔ پھر جب گجرات میں خود مختار مسلم حکومت کا دور آیا تو علمی ترقی کا نیا باب کھلا۔ محدثین، فقہاء، معقولین اور ماہرینِ ادب و بلاغت نے باقاعدہ معیاری مدارس قائم کیے۔ ان مدارس میں ہر فن کی منتہیانہ تعلیم ہونے لگی۔ بادشاہوں اور امراء نے دل کھول کر ان کی سرپرستی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مدارس سے ایسے ایسے جید اور لائق علماء وفضلاء پیدا ہوئے جنھوں نے گجرات کو علمی دولت سے مالا مال کر دیا۔ مدارس کے قیام میں نہروالہ پٹن اور احمد آباد کو خصوصیت حاصل رہی۔

حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی ۹۳۴ھ میں فارغ التحصیل ہوئے تو اس وقت ان کی عمر چوبیس یا پچیس سال کی تھی۔ اسی وقت انھوں نے درس و تدریس کا آغاز کیا۔ ابتدائے درس کا تاریخی مادہ ''شیخ وجیہہ'' ہے۔ یہ سلطان بہادر شاہ گجراتی کا ابتدائی عہد تھا۔ یعنی اس کی تخت نشینی کو صرف دو تین سال گزرے تھے۔ پہلے زمانے میں دستور تھا کہ صاحبِ علم وفضل جہاں بیٹھ جاتا کچھ دنوں کے بعد وہی مقام اپنے وقت کا دار العلوم بن جاتا اور آہستہ آہستہ امراء وسلاطین کی توجہ سے طلبہ کے لیے تمام سہولتیں بہم پہنچائی جاتیں۔ طلبہ کا ہجوم بڑھنے لگا تو شاہی محل کے بالمقابل (جہاں آج پارسی کلب اور روضہ شاہ وجیہہ الدین ہے) ۹۳۵ھ میں شاہ صاحب نے باقاعدہ ایک مدرسے کی بنیاد رکھی جو بعد میں مدرسہ علویہ کے نام سے موسوم ہوا۔ دھیرے دھیرے اس کی مقبولیت بڑھی تو طلبہ کے رہنے کے لیے حجرے بھی تعمیر کیے گئے اور وظائف کا بھی انتظام ہو گیا۔ شاہی مطبخ سے روزینہ پینتیس سکہ رائج الوقت ماہانہ بھی ملنے لگا۔ طلبہ کے علاج کے لیے ایک طبیب پندرہ سکہ رائج الوقت ماہانہ پر تھا[1]۔

حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی نے اس مدرسے میں ۶۴ سال تک تعلیم دی۔ اس زمانے میں عام طور سے اساتذہ اور معلمین کو 'میاں صاحب' کے تعظیمی لقب سے یاد کرتے تھے اس لیے شاہ وجیہہ الدین کے نام کے ساتھ 'میاں' کا جزو شامل ہو گیا۔ اور جب تذکرہ نگار آپ کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کے نام کے ساتھ بطور خاص اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔

(1) پاٹ نگر گجراتی میں یہ دونوں رقمیں تحریر ہیں۔ اس عہد کی ارزانی میں یہ رقم بہت تھی۔ مرآۃ احمدی میں یہ رقم ۳۷ سکہ ۸ آنے ماہوار ہے۔)

شاہ صاحب کی زندگی کا محبوب مشغلہ درس و تدریس تھا۔ اس سے آپ کی دلچسپی اس درجہ تھی کہ اپنی مدتِ درس میں کبھی آپ نے قصداً مدرسہ بند نہیں فرمایا اور نہ اسباق کا ناغہ ہونے دیا۔ ہر علم وفن کی یہاں تعلیم ہوتی تھی۔ ابتدا میں غالباً وہ تنہا مدرس تھے لیکن رفتہ رفتہ اساتذہ کی تعداد بڑھتی رہی اور طلبہ کی انتہائی ترقی پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے تلامذہ بھی اپنا وقت تدریس میں صرف کرتے ہیں جو خود ابھی فارغ نہیں ہوئے ہیں۔ گویا منتہی طلبہ کو درس و تدریس کی ٹریننگ دی بھی جاتی۔ یہ مدرسہ سچ پوچھیے تو اس زمانے کی یونیورسٹی تھا جس سے گجرات، مالوہ، خاندیس، کاٹھیاوار، سندھ اور دکن کے مدارس ملحق تھے۔

اس مدرسے میں ابتدائی تعلیم کے علاوہ صرف ونحو، عربی ادب، معانی و بلاغت، تفسیر مع اصول، حدیث مع اصول، فقہ مع اصول، منطق، فلسفہ، علم کلام، مناظرہ، ہیئت، اقلیدس، اسرارِ شریعت وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھیں۔ علومِ ظاہری کی تکمیل کر لینے پر جن تلامذہ کو تصوف کی طرف رجحان ہوتا تو اس کی بھی تعلیم دیتے۔ اس کے علاوہ ایسے اشخاص جو باہر سے آ کر اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے ان لوگوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ فتویٰ نویسی کا بھی باقاعدہ انتظام تھا۔ اور خاص طور سے اس کام پر ذمہ دار اشخاص کا تقرر ہوتا۔ عام فتوؤں کو چھوڑ کر جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو خود اس پر غور فرماتے اور تحقیقی جواب تحریر فرما کر اپنے دستخط سے اس کو مزین فرماتے۔ خود سلطنت بھی کسی اہم امر میں بغیر آپ کے دستخط کے احکام نہیں نافذ کرتی تھی۔ اور ایسے امر کو مشتبہ سمجھتی جس میں آپ کے دستخط نہ ہوں[1]۔

اس مدرسے میں ایک دار الاقامہ بھی تھا جس کے شکستہ حجرے اب تک موجود ہیں۔ ۹۹۸ھ تک اس مدرسے کا نظم ونسق خود شاہ کے ہاتھوں میں رہا۔ اس مدت میں سینکڑوں طلبہ اس سرچشمۂ علمی سے سیراب ہوئے۔ تذکرہ نگاروں نے آپ کے ان تلامذہ کی تعداد اتنی بتائی جنھوں نے اطراف ملک میں پھیل کر مدرسے قائم کیے اور خود مسندِ درس پر بیٹھے۔ جناب شاہ صاحب کی کمال خوش نصیبی یہ ہے کہ اپنی زندگی ہی میں شاگردوں کے شاگرد کو مسندِ علم پر رونق افروز ہو کر درس و وعظ کے ذریعے خلق کو ہدایت کرتے دیکھا۔ گویا ان کی زندگی کا اصل منشا آپ

1: از مقالہ ابوظفر ندوی۔ رسالہ معارف، ماہ فروری ۱۹۳۳ء۔

کے سامنے ہی پورا ہوگیا۔

یہ مدرسہ مدتِ دراز تک جاری رہا۔ آپ کے صاحبزادے اور پوتوں نے مدتِ دراز تک اسے باقی رکھا۔ معارج الولایت کے مصنف جناب غلام معین الدین اورنگ آبادی لکھتے ہیں کہ

''ابھی تک آپ کا مدرسہ باقی ہے جس میں طلبہ سکونت پذیر اور علماء تدریس میں مشغول ہیں[1]''

واضح ہو کہ معارج الولایت کا سن تصنیف ۱۰۹۴ھ ہے۔ اس مدرسے پر امراء و سلاطین نے اوقاف بھی مرحمت فرمائے جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

نصابِ درس :

شاہ صاحب کی تصنیفات اور ان کے شروح و حواشی ہی کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کون کون سی کتابیں اس وقت نصابِ درس میں شامل تھیں اور کتنے فنون پڑھائے جاتے تھے۔ مولانا سید عبدالحیٔ حسنی نے اپنی کتاب "الثقافة الاسلامية فى الهند" میں ہندوستان میں مروجہ نصابِ درس کے تین دور قرار دیے ہیں:

دورِ اوّل - ساتویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور انجام دسویں صدی پر اس وقت ہوا جبکہ دوسرا دور شروع ہوگیا تھا۔ کم و بیش دو سو برس تک نحو میں مصباح، کافیہ، لباب الالباب بیضاوی، ارشاد شہاب الدین دولت آبادی۔ فقہ میں ہدایہ۔ اصولِ فقہ میں منار اور اس کے شروح اور اصولِ بزدوی۔ تفسیر میں بیضاوی، مدارک اور کشاف۔ حدیث میں مشارق الانوار اور مصابیح السنۃ۔ منطق میں شرح شمسیہ۔ فنِ کلام میں شرح صحائف اور تمہید ابوشکور سالمی پڑھائی جاتی تھیں۔ اور اسی کو معیارِ فضیلت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن نویں صدی ہجری کے آخر میں سلطان سکندر لودھی کے دور میں جب شیخ عزیز اللہ اور شیخ عبداللہ تلنبی ملتان سے آئے تو انھوں نے معیارِ فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لیے قاضی عضد کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم سلسلۂ درس میں داخل کیں اور بہت جلد یہ کتابیں متداول ہوگئیں۔

اسی دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف کو رواج دیا اور تفتازانی کے شاگردوں نے مطول و مختصر کی بنیاد ڈالی اور تلویح و شرح عقائد نسفی کو رواج دیا۔ اسی

[1] معارج الولایت قلمی، جلد دوم، ص: ۵۸۲، مملوکہ خلیق احمد نظامی علی گڑھی۔

زمانے میں شرح وقایہ اور شرح ملا جامی بھی رفتہ رفتہ داخلِ نصاب ہوگئیں۔

نصابِ درس کا تیسرا دور شاہ فتح اللہ شیرازی اور علامہ وجیہ الدین علوی کے دور سے ہوتا ہے۔ اس دور میں معقولات کی طرف زیادہ اعتنا کیا گیا[1]۔

نصابِ درس کے اضافے میں شاہ وجیہ الدین کا حصہ :

اوپر کے بیان سے معلوم ہوا کہ عربی درسگاہوں کے نصابِ درس میں برابر تغیر ہوتا رہا لیکن وہ تغیر جس کے اثرات صدیوں رہے وہ نصاب دور کا تیسرا دور ہے اور اس میں حضرت شاہ وجیہ الدین علوی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ عام طور سے مروجہ نظامیہ درس کا سلسلہ شاہ فتح اللہ شیرازی سے جوڑا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک سلسلہ شاہ وجیہ الدین تک بھی پہنچتا ہے۔ مولانا سید عبدالحیٔ حسنی لکھتے ہیں کہ:

> ''نصابِ درس میں جو تغیر دور دور میں ہوا تھا اس سے لوگوں کی اُمنگیں بڑھ گئی تھیں اور وہ معیارِ فضیلت کو اس سے بھی زیادہ بلند کرنے کے متمنی ہوگئے تھے۔ اسی وجہ سے شاہ فتح اللہ شیرازی کے آتے ہی درسگاہوں میں نئی قسم کی چہل پہل نظر آنے لگی۔ دربارِ اکبری نے ان کو عضد الملک کا خطاب دے کر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا اور علماء نے نصابِ درس کے اس اضافے کو فوراً منظور کرلیا جس کو شاہ فتح اللہ نے پیش کیا تھا۔ مآثر الکرام میں میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مندرجہ ذیل عبارت میں اس کا اعتراف کیا ہے:
>
> ''تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوّانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان میر بہندوستان آوردو در حلقۂ درس انداخت و جم غفیر از حاشیۂ محفل استفادہ کردند و ازاں عہد معقولات را رواجی دیگر پیدا شد۔''

مگر یہ نہایت بے انصافی ہوگی اگر ہم شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کو اس موقع پر بھول جائیں۔ یہ بزرگ محقق دوّانی کے بیک واسطہ شاگرد تھے اور سب سے پہلے متاخرین کی تصنیفات

[1] اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں۔ ترجمہ مولانا ابوالعرفان ندوی۔ ص: ۱۷-۱۶۔

کو انھوں نے رواج دیا۔ اور اس چشمۂ فیض سے صرف گجرات ہی سیراب نہیں ہوا بلکہ اس کی چھینٹیں وسط ہند تک پہنچیں۔ قاضی ضیاء الدین نیوتنی (ضلع اناؤ) کے باشندے تھے۔ وہ گجرات سے یہ تحفہ لے کر آئے اور شیخ جمال نے ان سے حاصل کر کے دور دور تک پھیلایا۔ ملا لطف اللہ شیخ جمال کے ممتاز شاگرد تھے۔ ان سے ملا جیون صاحب نور الانوار، ملا علی اصغر، قاضی علیم اللہ، ملا محمد زماں وغیرہ نے حاصل کیا۔ جن میں کا ہر ایک فرد صاحب سلسلہ اور صاحبِ درس تھا۔ یہ تو ہوا مگر اس درس کو قبولیت عام اس وقت حاصل ہوئی جب شاہ فتح اللہ شیرازی نے اس کو رواج دیا۔ اور ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد ہندوستان بھر میں پھیل گئے۔ اس لحاظ سے میر آزاد کا لکھنا بھی صحیح ہے۔

ملا عبدالسلام شاہ فتح اللہ کے جلیل القدر شاگرد تھے۔ انھوں نے چالیس سال تک لاہور میں بیٹھ کر درس دیا اور ہزاروں کو فائدہ پہنچایا۔ مگر ہزاروں میں ایک دو ہی ایسے ہوتے ہیں جن کو ناموری اور بقائے دوام کے دربار سے سند ملتی ہے۔ دیوہ کے مفتی عبدالسلام اور الہ آباد کے شیخ محب اللہ انھی خوش نصیبوں میں تھے جو لاہور سے پڑھ کر آئے اور اپنے لیے مسندِ فضیلت علیحدہ قائم کردی۔ شیخ قطب الدین سہالوی انھی دونوں کے بیک واسطہ شاگرد ہیں جو ملا نظام الدین بانی درسِ نظامیہ کے پدر بزرگوار تھے۔[1]

شبیر احمد خاں غوری نے 'اسلامی ہند کے نصف اوّل میں علوم عقلیہ کا رواج' کے عنوان پر رسالہ معارف، اعظم گڑھ میں ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ جس میں وہ رقمطراز ہیں:

''ہندوستان میں علومِ عقلیہ کے رواج دینے میں محقق جلال الدین دوّانی کا خاص احسان ہے۔ یہاں کے اکثر علمی خاندانوں کا سلسلۂ تلمذ محقق دوّانی تک پہنچتا ہے۔ ان کے متعدد شاگرد یہاں تشریف لائے جن کی وجہ سے اس ملک میں معقولات کا بہت زیادہ رواج ہوگیا۔ محقق دوّانی کے دو شاگرد ابو الفضل گازرونی اور ابوالفضل استرآبادی گجرات آئے۔ ابوالفضل گازرونی کے شاگرد شیخ مبارک اور ابو الفضل استرآبادی کے شاگرد وزیر آصف خاں

۱: اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں از مولانا سید عبدالحئی ترجمہ مولوی ابوالعرفان ندوی۔

(عبدالعزیز گجراتی) تھے۔ تیسرے شاگرد ملا عماد طارمی تھے۔ وہ بھی گجرات آئے۔ ان کے شاگرد مولانا وجیہ الدین گجراتی تھے۔ جو ایک کثیر الدرس اور کثیر التصنیف عالم تھے۔ علومِ دینیہ و ادبیہ کے علاوہ انھوں نے فلسفہ وحکمت اور ریاضی وہیئت کی متعدد کتابوں پر بھی شروح وحواشی لکھے۔

ایک اور شاگرد میر رفیع الدین صفوی تھے۔ مگر انھوں نے حدیث کے ساتھ اعتناء کیا۔ بعد میں صفویوں کے مظالم سے تنگ آکر ہندوستان چلے آئے۔ جہاں وہ آگرہ میں حدیث کا درس دیتے تھے۔ محقق دوّانی کے شاگردِ رشید خواجہ جمال الدین محمود شیرازی تھے۔ وہ بھی صفویوں کے مظالم سے تنگ آکر مکہ معظمہ ہوتے ہوئے آخرکار میر رفیع الدین کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے۔ خواجہ جمال الدین محمود کے شاگرد میرزا جان شیرازی تھے۔ جن سے وہ سلسلہ چلا جس میں میر زاہد اور شاہ ولی اللہ دہلوی منسلک ہیں۔

خواجہ جمال الدین محمود کے دوسرے شاگرد میر فتح اللہ شیرازی تھے۔ جو بعد میں میر غیاث الدین منصور کے شاگرد ہوگئے تھے۔ انھوں نے مولانا کمال الدین مسعود شروانی اور مولانا کرد سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ پہلے امیر فتح اللہ کے شاگرد امیر غیاث اللہ دکن آئے اور علی عادل شاہ کے مقرب خاص ہوگئے۔ بعد میں ان کی ایماء پر امیر فتح اللہ بھی دکن چلے گئے جہاں بادشاہ نے وکیل در بنا دیا۔ مگر کچھ دن بعد سیاسی انتشار سے پریشان ہوکر پہلے عبدالرحیم خانخاناں کے پاس گجرات گئے، پھر اکبر کی طلب پر ۹۹۱ھ میں لاہور پہنچے۔ اکبر نے بڑے عزّت و احترام سے انھیں نوازا۔ امیر فتح اللہ نے علمائے ولایت کی کتب معقولات کو ہندوستان میں رواج دیا۔''[2]

۲: رسالہ معارف، فروری ۱۹۶۳ء۔

شاہ وجیہہ الدینؒ کے روحانی مرشد

شاہ وجیہہ الدین اپنے ابتدائے شباب ہی میں وادیٔ تصوف میں قدم رکھ چکے تھے مگر جس شخصیت نے انھیں روحانی طور پر سب سے زیادہ متاثر کیا وہ شاہ محمد غوث گوالیاری کی بلند و بالا روحانی شخصیت ہے۔ شاہ محمد غوث گوالیاری کا سلسلۂ نسب خواجہ فرید الدین عطار (۶۲۸ھ/ ۱۲۳۰ء) سے ملتا ہے۔ ان کی ولادت ۷؍رجب ۹۰۷ھ کو ہوئی۔ سات برس کی عمر میں راہِ طریقت میں قدم رکھا۔ نو سال میں معرفت حاصل ہوئی۔ پندرہ سال کی عمر میں رشد و ہدایت کا منصب ملا۔ بائیس سال کی عمر میں مقام عروج حاصل ہوا۔ پچیس سال کی عمر میں طالبانِ طریقت کو ہم رنگ بنانے لگے۔ تینتیس سال کی عمر میں مرجعِ خاص و عام اور مقتدا و پیشوا بن گئے۔ چالیس سال کی عمر میں بادشاہوں سے اختلاف پیدا ہوا تو سفر اختیار کیا۔ شاہ فضل اللہ شطاری مناقب غوثیہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''جب بارہ سال کی عمر ہوئی تو طلب خدا میں سرگرداں ہوتے ہوئے جونپور تشریف لائے اور قاضی صدر جہاں کے مکان پر قیام کیا۔ قیام کے دوران تحصیل علم میں مصروف رہے۔ کافیہ وغیرہ تک عبور حاصل کرلیا۔ پھر اسی کو کافی سمجھ کر علم باطنی کی تلاش میں مصروف ہوگئے۔ شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست کی خدمت میں فیضِ روحانی حاصل کیا اور پھر انہی کی ہدایت پر حاجی

> حمید الدین حضور کی خدمت میں گئے۔ موصوف نے انھیں سلسلۂ شطاریہ میں بیعت فرمایا۔ آپ کے ساتھ آپ کے برادر بزرگ شیخ پھول (متوفی ۹۴۵ھ/ ۱۵۳۸ء) بھی تھے۔ حاجی حمید الدین حضور نے دونوں بھائیوں کو اپنی فرزندی میں لیا۔ نامور خانوادوں کے مشائخ کے جو کمالات اور حالات رکھتے ہیں ان کے اطوار اور اسرار بالخصوص مشربِ شطار کی رفتار، دعوت کا فن، اذکار کی طرز اور اشغال و تصورات کی سندیں عطا کیں اور تعلیم و تلقین کے بعد شیخ پھول کو اپنے ہمراہ لے کر صوبہ بہار کی طرف روانہ ہوگئے اور شیخ محمد غوث کو مزید فیضان کے لیے کوہستان چنار میں ریاضت کے لیے چھوڑ دیا۔ شیخ محمد غوث تیرہ سال چند مہینے عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ درختوں کے پتے کھا کر یادِالٰہی کی۔ اس کے بعد جب حاجی حمید الدین حضور واپس ہوئے تو مرید کو بامراد پایا۔ اسی عرصے میں اپنی مشہور تصنیف 'جواہر خمسہ' لکھی۔ حاجی حمید الدین حضور نے تمام منازلِ سلوک طے کرائے اور خرقۂ خلافت عطا کیا۔''

غوثی نے گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ ''آپ روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ آپ نے جس کسی کو قبول کرلیا اس کے سر کی اور دل کی آنکھوں کو مشاہدہ اور معائنہ کا نور حاصل ہوگیا اور ان میں حقیقت بینی کی قوت آگئی۔''

مغل بادشاہوں میں بابر، ہمایوں آپ کے نہایت قدرداں اور عقیدت مند رہے۔ جلال الدین اکبر نے گراں بہا جاگیر مقرر کی۔ شیخ نے اس رقم سے گوالیار میں ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی جہاں وجد و سماع کا شغل رہتا۔ شیخ خود بھی معرفت کے گیت بنواتے اور گویوں سے گواتے۔ شیخ محمد غوث نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ رسالہ معراجیہ، جواہر خمسہ، کلید مخازن، کنز الوحدۃ، ضمائر و بصائر آپ سے یادگار ہیں۔ بحرالحیات جوامرت کنڈ کا ترجمہ ہے اس میں شیخ محمد غوث نے ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال کو فارسی میں منتقل کیا اور اپنی ابتدائی تصنیف جواہر خمسہ میں بھی ان کی ایک آدھ جھلک دکھائی۔ اس سے شطاریہ طریقے کے اس ارتباط پر روشنی پڑتی ہے جو اس کا ہندو یوگ سے تھا۔ شیخ محمد غوث نے ۱۵۶۲ء میں اسی سال کی عمر

میں وفات پائی اور گوالیار میں اپنے عالی شان روضے میں دفن ہوئے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا گویّا تان سین آپ ہی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا اور آپ ہی کے روضے کے احاطے میں دفن ہے[1]۔

شاہ محمد غوث گوالیاری کی گجرات میں آمد اور واقعۂ تکفیر:

۹۴۷ھ میں جب افغان سور کا غلبہ ہوا اور شیر شاہ بر سر اقتدار آیا تو اس نے شیخ محمد غوث کو پریشان کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مجبوراً آپ ہجرت فرما کر گجرات تشریف لائے۔ چونکہ شیخ محمد غوث سے نصیر الدین ہمایوں بادشاہ کو خاص عقیدت اور تعلق تھا اور بعض مہم میں آپ سے اس نے مشورے بھی کیے تھے اور مراحم خسروانہ سے بھی سرفراز ہوئے تھے اس لیے شیر شاہ کو آپ سے کد پیدا ہوگئی۔ شیر شاہ کو ان کے ساتھ ایک اور نفرت کی وجہ تھی کہ بعض حاسدوں نے آپ کی تصنیف 'معراج نامہ' شیر شاہ کے سامنے پیش کی اور یہ کہا کہ اس میں بہت سی خلاف شرع باتیں ہیں۔ اس پر وہ غضبناک ہوا اور آپ کی ایذا رسانی کے درپے ہوگیا اور آپ مجبوراً ہجرت کر کے گجرات آئے۔ چنانچہ اپنی کتاب 'اوراد غوثیہ' میں اس طرح فرماتے ہیں:

''چہل سالہ بود کہ از بادشاہان تفاوت پیدا شد سفر اختیار کرد، در ولایت گجرات آمد[2]۔''

لیکن اس معراج نامے کی شہرت گجرات میں بھی پہنچ چکی تھی۔ گجرات کے مقتدر علماء آپ کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے۔ چنانچہ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

> آپ نے عروج حال میں ایک کتاب موسوم بہ 'معراج نامہ' تصنیف فرمائی تھی اور اس میں اپنے عروج حال کے مقامات کا ذکر کیا تھا۔ جب ہمایوں معزول الریاست ہوا اور ہندوستان سے ایران چلا گیا تو حاسدوں نے شیخ کی تصنیف 'معراج نامہ' شیر شاہ کے سامنے پیش کی اور کہا کہ اس میں شیخ نے بہت سی باتیں خلاف شرع لکھی ہیں۔ چنانچہ شیر شاہ آپ کی ایذا رسانی کے درپے ہوگیا۔ مجبوراً شیخ گوالیار سے ہجرت فرما کر گجرات تشریف لائے۔ علماء گجرات

۱: رود کوثر از شیخ محمد اکرام۔ ص: ۴۱۔

۲: اوراد غوثیہ، مطبوعہ ۱۳۱۳ھ۔ ص: ۷۶۔

بھی شیخ کی دشمنی پر آمادہ ہوگئے اور محضر تیار کر کے قتل کے درپے ہوئے۔ ان حالات میں شیخ وجیہ الدین گجراتی (جو گجرات کے علماء و صلحاء اور مشائخ کے پیشوا تھے اور شیخ محمد غوث سے ان کو ارادت بھی تھی۔) نے فرمایا کہ جب علماء کی مجلس منعقد ہو اور معراج کے بارے میں بات آئے تو شیخ یہ فرمادیں کہ مجھ کو یہ معراج عالم واقعہ میں پیش آئی تھی۔ بیداری اور ہوش کے عالم میں نہیں۔ الغرض جب علماء کا معرکہ گرم ہوا تو شیخ نے فرمایا کہ یہ معراج عالم بے خودی میں واقع ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے ظاہر کی کچھ خبر نہ تھی، چنانچہ اس تدبیر سے علماء گجرات نے شیخ کی آزار رسانی سے درگزر کیا[1]۔''

ملا عبد القادر بدایونی اس واقعہ کو دوسرے انداز سے لکھا ہے۔ وہ شیخ کے ہمعصر ہیں اس لیے ان کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جب سلطان محمود گجراتی کے زمانے میں شیخ محمد غوث ہندوستان سے گجرات آئے تو شیخ علی متقی نے جو مشائخ کبار اور وقت کے علماء میں بڑے با اقتدار تھے ان کے قتل کا فتویٰ صادر کردیا۔ سلطان نے اس فتویٰ کو میاں وجیہ الدین کے دستخط و تصدیق پر منحصر کردیا۔ چونکہ میاں وجیہ الدین شیخ محمد غوث کے گھر جا چکے تھے اور پہلی ہی بار میں ان کے شیدا و فریفتہ ہوگئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس فتویٰ کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ جب شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو وہ دوڑے ہوئے میاں صاحب کے گھر آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیے اور پوچھا:
>
> ''چرا بہ شیوع بدعت و وقوع رخنہ در دین راضی میشوید؟'' یعنی آپ بدعت کی اشاعت اور دین میں رخنہ اندازی پر کس طرح راضی ہوگئے؟
>
> شاہ وجیہ الدین جن کا قلب پہلے ہی شیخ گوالیاری کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہو چکا تھا، جواب دیا:

۱: مقالہ 'گجراتی مسلمان اور گجری زبان' از قاضی سید نورالدین حسین بھروچ، نوائے ادب، جولائی ۱۹۶۷ء۔

''ما ارباب قالیم وشیخ اہل حال۔ فہم ما بکمالات اونمی رسد و بظاہر ہر شریعت ہیچ اعتراض قادح بر و متوجہ نمی گردد۔'' (ہم اہل قال میں سے ہیں اور شیخ محمد غوث اہلِ حال میں سے ہیں۔ ہم ان کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور ظاہری شریعت کے اعتبار سے بھی ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔)

پھر ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ:

''شیخ محمد غوث گوالیاری سے سلاطینِ گجرات کو جو عقیدت رہی ہے اس کا سبب یہی واقعہ ہے۔ میاں صاحب کے رویہ سے شیخ موصوف پھانسی پانے سے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد میاں صاحب اکثر اپنی مجلسوں میں کہا کرتے تھے: ''نظر بظاہر شریعت چناں باید بود کہ شیخ علی متقی است و در حقیقت آنچناں کہ مرشد ماست[1]۔'' (ظاہر شریعت پر ایسی نظر ہونی چاہیے جیسی شیخ علی متقی کی ہے اور حقائق پر ایسی جیسی ہمارے پیر (شیخ محمد غوث) کی نظر ہے۔)

شیخ محمد غوث اہل وعیال، مریدوں اور ساز و سامان کے ساتھ گجرات میں تقریباً اٹھارہ سال رہے۔ کچھ وقت چمپانیر اور بھڑوچ اور باقی وقت احمد آباد میں گزارے اور پھر گجرات میں بھی بڑا اقتدار حاصل کیا۔ شاہ و گدا سب نے آپ سے فیض حاصل کیا۔

سلسلۂ شطاریہ اور شاہ محمد غوث:

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری (بارہویں اور چودھویں صدی عیسوی) میں ایران اور عراق سے تین مشہور سلاسلِ طریقت جنوبی ہندوستان میں داخل ہوئے۔ چشتیہ، سہروردیہ اور فردوسیہ۔ سلسلۂ چشتیہ شمالی ہند میں زیادہ پھیلا۔ سلسلۂ سہروردیہ پاکستان کے سابق صوبہ سندھ میں زیادہ پھیلا اور سلسلۂ فردوسیہ مشرقی ہندوستان کے بہار و بنگال میں پھیلا۔

مغلیہ دورِ حکومت میں ہند و پاک میں باہر سے نئے سلاسلِ طریقت آئے: شطاریہ، قادریہ اور نقشبندیہ۔ سلسلۂ شطاریہ کے پیشوا شیخ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن آدم بسطامی ۲۶۰ھ/ ۸۷۳ء ہیں۔ اس سلسلے کو ایران میں 'عشقیہ' کہتے ہیں۔ روم میں 'بسطامیہ' اور ہند و پاک میں

[1] منتخب التواریخ، صفحہ: ۲۹۲ تا ۲۹۳۔ مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۶ء۔

'شطاریہ' کہتے ہیں۔ نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) کے آخر میں شاہ عبداللہ شطاری (م ۸۹۰ھ/ ۱۴۸۵ء) ایران سے ہند و پاک تشریف لائے اور اس سلسلہ کو پھیلایا۔ شیخ موصوف پانچ واسطوں سے شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں ہیں اور سات واسطوں سے حضرت بایزید بسطامی سے بیعت ہیں۔ آپ کا مزار مالوہ کے سابق دارالسلطنت مانڈو میں قلعہ کے اندر ہے۔ شیخ موصوف کے انتقال کے بعد آپ کے خلیفہ شیخ محمد علاء المعروف بہ شیخ قاذن شطاری نے اس سلسلے کو پھیلایا۔ آپ کا مرکز ضلع مظفر پور (بہار) کا جنوبی علاقہ تھا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند اکبر شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست (م مابعد ۹۴۶ھ/ ۱۵۷۸ء) نے سلسلۂ شطاریہ کی اشاعت کی۔ موصوف کا مزار حاجی پور (بہار) کے قریب ہے۔ آپ کے بعد آپ کے خلیفہ شیخ ظہور حاجی حمید الدین حصور نے اس سلسلے کو پھیلایا۔ اور پھر آپ کے انتقال کے بعد آپ کے خلیفہ شیخ محمد غوث گوالیاری سے سلسلۂ شطاریہ کی خوب اشاعت ہوئی۔ چنانچہ آگرہ، دہلی، برہان پور، احمد آباد، سنبھل، اجمیر، سرہند، کالپی، بیجاپور، اُجین، سارن وغیرہ میں آپ کے بیشمار مرید ہوئے۔

سلسلۂ شطاریہ کی اشاعت ایک اور طریقے سے بھی ہوئی اور وہ ہے شیخ علی قوام جونپوری (جنہیں علی عاشقان سرائھیری بھی کہا جاتا ہے) کا سلسلہ۔ شیخ علی قوام، شیخ عبدالقدوس نظام آبادی کے خلیفہ تھے۔ ان کو شیخ قُدّن بھی کہا جاتا ہے اور یہ خلیفہ تھے شیخ حافظ جونپوری کے۔ اور موصوف شیخ عبداللہ شطاری کے خلیفہ تھے۔ اس طرح ہند و پاک میں دو شاخوں سے سلسلۂ شطاریہ کی اشاعت ہوئی۔ ایک شیخ علی قوام جونپوری کے ذریعے اور دوسرے شاہ محمد غوث گوالیاری کے ذریعے۔ سلسلۂ شطاریہ کا کافی عرصہ تک اثر و نفوذ رہا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس سلسلے کے اشغال واذکار اپنے استاد شیخ ابوطاہر مدنی اور حاجی محمد سعید لاہوری سے سیکھے تھے[1]۔

شطار کی وجہِ تسمیہ:

عشقیہ یا بسطامیہ سلسلہ کے لوگ اپنے کو شطاری کیوں کہتے ہیں اور اس کی وجہ کیا ہے؟ گلزار ابرار کے مصنف محمد حسن غوثی جو اس مشرب سے تعلق رکھتے ہیں، لکھتے ہیں:

[1] شاہ محمد غوث گوالیاری مصنفہ پروفیسر مسعود احمد۔ صفحہ: ۵ تا ۷۔

"شطار کی وجہ تسمیہ کے متعلق کسی قلم نے کوئی صریح اور واضح بات نہیں لکھی ہے لیکن ایک رسالہ ہے 'لطیفہ غیبیہ' نام جو شاہ عبداللہ شطاری کی تصنیف ہے۔ اس رسالہ کی فصل ثانی میں کسی قدر وجہ تسمیہ کی نسبت آگاہی دی گئی ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ خدا شناسان اُمتِ محمدی سلوک میں تین مشرب پر منقسم ہیں۔ (۱) اخیار، (۲) ابرار، (۳) اور شطار۔ اور ان تینوں گروہوں میں سے ہر ایک گروہ ورد، ذکر، شغل، فکر، کشف اور قرب جدا جدا رکھتا ہے۔ اور اپنے اپنے خاص طریقے کو بموجب صاحبِ استعداد کامل ہے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ علماء اُمتی کا بنیاد بنی اسرائیل کے مضمون پر نظر کر کے فرق اور عدم فرق کی رعایت اس گروہ کے بارے میں بھی اسی کے مطابق کی جائے۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرق و عدم فرق کی نسبت قرآن شریف کے اندر ارشاد ہے یعنی ان کی نسبت اعتقاد اور ولایت کے اقرار میں تفاوت اور اختلاف کو دخل نہ دیا جائے اور جو حکم رسولوں کے ایمان کی نسبت "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" (یعنی ہم رسولوں میں سے کسی کے مابین فرق نہیں رکھتے) ہے، اس پر قیاس کیا جاوے تا کہ شریعت کا ایسا ایمان حاصل ہو جو طریقت کے وصف کے ساتھ موصوف ہو۔ اور جس طرح کہ انبیاء علیہم السلام کے زمرے میں قرب، وحی، معجزات، نسخ، عدم نسخ، اولوالعزمی، اُمت کی کثرت و قلت اور نیز ان امور کے سوا دیگر امور کے اعتبار سے فرق سمجھا جاتا ہے، اسی طرح چونکہ یہ گروہ مشابہ بانبیاءِ بنی اسرائیل ہے، لہٰذا اسی طرح اس گروہ کے اندر بھی افضلیت، سرعت سیر، بطوءِ سیر، ریاضت اور عبادت کے اعتبار سے سلوک میں عالم آخرت کی طرف سے سمجھی جاوے۔ اور احوالِ درجات، مقامات اور خطابات کے اعتبار سے اعیانِ ثابتہ (صور علمیہ) کے بموجب منجانب مبداء سمجھی جاوے۔ آیت کریمہ "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" کے اشارہ سے جو معنی ذہن میں آتے ہیں اسی کے مطابق اس مقام سے یہ بات خیال میں آتی ہے

کہ اس لقب کی خصوصیت منازل طریقت کے طے کرنے میں تیز روی کے اعتبار سے ہے۔ العلم عند اللہ!....... چونکہ یہ گروہ عالم مرکبات کو طے کر کے مجردات کے عالم میں معنوی سرعت کے ساتھ جاتا ہے اس سبب سے اس گروہ کو 'شطار' کا لقب دیا گیا[۱]"

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سلسلے کے بزرگ سلوک اور طریقت میں دوسرے سلسلوں کے بزرگوں سے زیادہ تیز اور سرگرم (شطار) ہوتے ہیں۔

ذوقی شاہ اپنی کتاب 'سرِّ دلبراں' میں لکھتے ہیں:

"طالبانِ راہِ حق کے طبائع میں بہت کچھ اختلاف ہوتا ہے اور سب کو ایک ہی لکڑی سے نہیں ہانکا جا سکتا۔ شیخ طبیب دل ہوتا ہے اور ہر مریض کی طبیعت پر نظر کر کے اور نوعیت مرض کو دیکھ کر اس کا علاج کرتا ہے اور اس کے مناسب حال نسخے تجویز کرتا ہے، اس لیے سلوک کے طریقے بے تعداد ہیں لیکن جو طریقے زیادہ عام اور اقرب ہیں وہ یہ ہیں:

طریق اخیار - کثرتِ صوم وصلوٰۃ و تلاوت و حج و جہاد وغیرہ کے ذریعے منزل مقصود پر پہنچنا۔

طریق اصحاب مجاہدات و ریاضات - اخلاق ذمیمہ کو جدوجہد، محنت و کوشش اور ریاضت و مجاہدہ سے اخلاق حمیدہ میں تبدیل کرنا اور اس طور پر عالم علوی سے مناسبت پیدا کر کے اپنا راستہ طے کرنا۔

طریق اصحاب شطار - ریاضت سے گریز، صحبتِ خلق سے پرہیز، ماسوا سے بیزاری، درد و اشتیاق، ذوق و شوق اور ذکر و فکر کے علاوہ کسی اور شغل سے سروکار نہ رکھنا۔ اس طریقے کی خصوصیت یہ ہے کہ اوّل الذکر دونوں طریقوں کے مقابلہ میں وصول الی اللہ کا یہ طریقہ زیادہ اقرب و قوی ہے۔ کامیابی کے لیے کشش ربانی نہایت ضروری ہے لیکن اس عنایت الٰہی سے وہی نوازے

[۱] گلزار ابرار۔

جاتے ہیں جو اس راستہ میں جدوجہد کرتے ہیں۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت) یعنی جن لوگوں نے ہماری راہ میں محنت کی ہم انھیں ضرور اپنی راہ دکھا دیں گے[1]

مشربِ شطار کے اصول:

دسویں صدی ہجری کے بزرگ شیخ بہاء الدین شطاری نے مشرب شطاریہ پر کتاب لکھی ہے۔ اس مشرب کے مضمرات و متعلقات کے متعلق لکھتے ہوئے طریق شطاریہ کے دس اصول کا خاص طور سے تذکرہ کیا ہے۔

''اول توبہ ہے اور اس کا مقصد خدا کے سوا تمام مطلوب سے خروج ہے۔

دوم زہد ہے اور اس کا مقصد دنیا اور اس کی محبت، اس کے اسباب اور اس کی لذتوں اور شہوتوں سے پرہیز ہے خواہ وہ کتنی تھوڑی ہوں۔

سوم توکل ہے اور وہ اسباب سے خروج ہے۔

چہارم قناعت ہے اور وہ نفسانی لذات سے خروج ہے۔

پنجم عزلت ہے اور وہ خلقت کے میل جول سے گوشہ نشینی اختیار کرنا اور انقطاع ہے بالکل اس طرح جیسے موت کے وقت ہوتا ہے۔

ششم حق کی طرف توجہ ہے اور اس کا مقصد ہر بلانے والے سے جو غیرِ حق کی طرف بلائے، خروج ہے۔ جیسے موت کے ساتھ ہوتا ہے نہ کوئی مطلوب ہو اور نہ محبوب اور نہ خدا کے سوا کوئی مقصود ہو۔

ہفتم اور وہ ہے صبرِ نفس کے حظوظ سے مجاہد کے ساتھ۔

ہشتم رضا ہے اور وہ نکلنا ہے نفس کی رضا سے خدا کی رضا میں داخل ہونے کے ساتھ۔ احکامِ ازلیہ کی تسلیم اور تدبیرِ الٰہی کی طرف تفویض کے ساتھ بغیر اغراض کے۔ جیسا کہ موت کے ساتھ ہوتا ہے۔

نہم ذکر ہے اور وہ نکلنا ہے ماسوا اللہ کے ذکر سے۔

1۔ سیرِ دلبراں۔ ص: ۲۲۳۔

دہم مراقبہ ہے اور وہ نکلنا ہے اس کے وجود اور قوت سے جیسے موت کے ساتھ ہوتا ہے[1]''

شطاری طریقے کی توسیع واشاعت میں خلفاءِ شاہ محمد غوث کا حصہ:

شطاری طریقے کی توسیع واشاعت میں شاہ محمد غوث گوالیاری کے خلفاء کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے ذریعے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں یہ طریقہ پھیلا اور مدتوں اس کے اثرات رہے۔ محمد حسن غوثی نے اپنے دور تک کی جو تفصیل دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا فیض روحانی ہند و پاک کے دور دراز حصوں تک پہنچا۔ اہم شہروں میں آپ کے تربیت دادہ عارف، فاضل اولاد اور رہنمایانِ خلق وخلفاء جا پہنچے۔ گلزار ابرار میں ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

''گوالیار میں جہاں آپ کا مرقد مبارک ہے جانشینی اور سجادگی کے مراسم آپ کے صاحبزادہ شیخ عبد اللہ المعروف بہ شیخ بدھا عمدہ طور پر انجام دیتے ہیں۔ نیز شیخ مبارک عالم جو اطراف بانگرمئو کے باشندہ ہیں یہ بھی یہیں تھے۔ جامع علوم تھے اور ظاہری و باطنی صفائی بھی رکھتے تھے۔ کم وبیش چالیس سال اصحاب خانقاہ کو کتابی علوم کا درس دیا۔ نیز شیخ بدیع الدین جیلانی سمرقندی شیخ محمد غوث کے بزرگ خلفاء میں سے ہیں۔ یہ بھی گوالیار ہی میں تھے۔ انھوں نے کلید مخازن اور کنز الوحدۃ پر عمدہ حاشیے اور تعلیقات لکھی ہیں۔

دار السلطنت آگرہ میں شیخ نور الدین ضیاء اللہ زندگی بخش نے اپنے پدر بزرگوار کے رہنے سہنے کی جگہ سنبھالی تھی اور شیخ عبد اللہ صوفی بھی یہیں تھے۔ جنھوں نے روشن ضمیر پیر سے کامل طور پر عرفانی و وجدانی مقامات حاصل کیے تھے۔

برہان پور خاندیس میں شیخ اکمل الدین برہان تھے۔ ان کے پدر بزرگوار کے ظاہری اور معنوی فرزند اور بھی تھے لیکن پدر بزرگوار کی ہدایت سے اقتباسِ نور کرنے میں یہ معنوی فرزند سب میں پیش دست اور مقدم تھے۔ اور اخیر عمر میں بالکل استغراق ہو گیا تھا۔ اور ان کی زبان میں موحدانہ کلام اور تقریر کے سوا کچھ بھی گویائی باقی نہیں رہی تھی۔ نیز شیخ لشکر محمد عارف نے بھی یہیں برہان پور

1۔ خم خانۂ تصوف۔

میں سلسلۂ ہدایت جاری کر رکھا تھا۔ اسی شہر میں قاضی سراج محمد بنبانی بھی تھے۔ معرفت کا چراغ اور علمی وعینی جزئیات کی شمع انہی کی ذات سے روشن تھی۔ شیخ نظامی گنجوی کی کتاب 'مخزنِ اسرار' کی مشکل عبارتیں اور مضامین حل کر کے آپ نے اہلِ جہاں کو فیض پہنچایا۔

برودرہ (بڑودہ) گجرات میں شیخ صدر الدین محمد شمس ذاکر تھے۔ آفتاب تلقین سمت الراس پر انہی بزرگوار کی بدولت پہنچا تھا۔ اور شیخ حبیب شطاری بھی اسی شہر میں سلوک کے اندر اپنے مریدوں کو تیز روی تعلیم کیا کرتے تھے۔

احمد آباد- گجرات میں آپ کے فرزندوں میں سے شیخ اویس اور شیخ اسماعیل ہیں۔ ان کے نانا سادات میں سے ہیں اور میر ابوتراب کے عم مکرم ہیں۔ ان دونوں عالی مقدار گوہروں میں سے اولین جواہرِ خمسہ کے اوراد، دعوت، اذکار، اشغال اور رموز وعلوم کے بخوبی عالم ہیں۔ اور دوسرے بھی مشائخ طریقت کے عادات وصفاتِ ظاہر و باطن دونوں میں آراستہ و پیراستہ ہیں۔ بال کمال اور آل میں ترقی ہو۔ یہاں احمد آباد میں آپ کے خلفاء میں سے دو صاحب ہیں ایک شیخ وجیہہ الدین احمد علوی جن کے فیضان سے طالبانِ علم وعرفان کے دل زندہ اور زبانیں گویا ہوئی ہیں۔ دوسرے شیخ علی شیر بنگالی ہیں۔ انھوں نے جواہرِ خمسہ کا انتخاب کیا اور عمل میں لائے۔ اکثر علوم میں بڑے صاحب دستگاہ تھے۔ خاص کر علم ہیئت، نجوم، حکمت اور ہندسہ اچھی طرح جانتے تھے اور مسائل علوم کے مغز کو پہنچے تھے۔ آپ نے 'جام جہاں نما' کی ایک مفید اور مبسوط شرح لکھ کر اس کو شرابِ معارف سے لبالب کیا ہے۔ سوانح امام احمد غزالی پر حسب ارشاد غوث الاولیاء ایک محققانہ شرح لکھی ہے۔

سنبھل میں شیخ محمد عاشق طالبانِ حق کا کام انجام دیتے ہیں۔ اجمیر میں مولانا عبد الفتاح ناگوری لوگوں کی حلِ مشکلات کیا کرتے تھے۔ سرہند میں شیخ محمد جمالی نے مسندِ ارشاد کو حسن دے رکھا تھا۔ کالپی میں شیخ جلال واصل

سالکانِ راہ کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیتے تھے۔ بدولی میں شیخ جیوا عبد الحئی نام تھے۔ یہ ایک مدت تک گوالیار میں بھی خدا پرستی کا طریقہ عمل میں لا چکے تھے۔ بیجاپور دکن میں شیخ شمس الدین شیرازی نے دانش و بینش کو رونق دی تھی۔ اُجین مالوہ میں شیخ احمد متوکل اور شیخ عالم نے اپنے تئیں سپردِ خدا کر رکھا تھا اور رضا بقضا کا راستہ ہمت اور اخلاص کے قدم سے طے کرتے تھے۔ سارنگ پور مالوہ میں شیخ منجھن تھے۔ کتابی علم اور قلبی وجدان کی بنیاد شہر والوں کے دلوں میں انھی نے رکھی تھی۔ دوسرے شیخ عمر ہیں علوم، عرفان، طریقت اور توحید کے جواہرات کی آپ کو کان سمجھنا چاہیے۔ اپنے وقت کے استاد اور مرشد تھے۔[1]"

طریقۂ شطاریہ کی اشاعت میں شاہ وجیہہ الدین کی خصوصیت :

شاہ محمد غوث کے خلفاء میں شاہ وجیہہ الدین ایسے بزرگ ہیں جن کی بدولت عرب و عجم دونوں میں لوگ اس سے روشناس ہوئے۔ ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ چودہ سو خلفاء و مریدین کی تعداد نے آپ سے فیض پایا۔ لیکن بڑی خصوصیت ان کی یہ ہے کہ آپ کے شاگردِ رشید اور خلیفہ شیخ صبغتہ اللہ بھروچی نے نہ صرف جواہرِ خمسہ کو عربی میں منتقل کیا بلکہ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر عالم اسلام میں اس طریقے کو پھیلایا۔ ان کے مریدین و خلفاء میں سیّد میر، سیّد اسعد بلخی اور شیخ احمد شناوی کے ذریعے عرب اس سلسلے میں منسلک ہوئے۔ ان کے مرید المرید شیخ احمد قشاشی (۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۰ء) اور ان کے جانشین ملا ابراہیم القرانی (۱۱۰۹ھ/ ۱۶۹۷ء) کی وساطت سے یہ سلسلہ جزائر انڈونیشیا، جاوا اور سماٹرا وغیرہ میں بھی پھیلا۔

[1]: اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار۔ صفحہ: ۲۸۳ تا ۲۹۰۔

اخلاق وعادات

انسان فضل وکمال کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو لیکن اس کے اندر اخلاقِ محاسن کی کمی اور خصائلِ حسنہ کی جھلک نہ ہو تو اس کی شخصیت پُرکشش اور جاذبِ توجہ نہیں ہوتی۔ ویسے بھی ایک عالمِ دین کو باعمل اور خوش اخلاق ہونا ضروری ہے۔ امیر خسروؔ نے کہا ہے۔

آں گفت مذکر نہ کند خلق کہ او را
گفتار بسے یابی و کردار نیابی

(یعنی جو نصیحت گو ایسی باتوں کی لوگوں کو نصیحت کرے جو خود اس پر عامل نہ ہو تو خلق اسے شمار میں نہیں لاتی۔)

شاہ وجیہہ الدین علوی نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہ خود بڑا پاکیزہ اور انسانی اوصاف اور دینی اخلاق کے لحاظ سے اپنا امتیازی مقام رکھتا تھا۔ پھر جید اساتذہ اور صالحین کی صحبت نے اس میں اور بھی جلا پیدا کردی تھی۔ اس لیے ان کی زبان سے جو الفاظ نکلتے وہ لوحِ دل پر نقش ہو جاتے۔ ان کا جذبۂ محبت، ہمدردانہ برتاؤ، مشفقانہ سلوک صرف طلبہ اور مدرسے کی فضا تک محدود نہ تھا بلکہ عوام تک اس سے متاثر ہوتے۔ ان کے تقویٰ، خدا ترسی، سادگی، عجز وانکسار، ہمدردی وخلوص کو جو کوئی دیکھتا گرویدہ ہو جاتا۔ وہ حقیقت میں مکارمِ اخلاق کے پیکر اور استغنا و بے نیازی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اقبالؔ نے جو کہا ہے۔

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز

تو بڑی حد تک یہ حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کی ذاتِ گرامی پر بھی صادق آتا ہے۔ وہ اپنے تمام ہمعصروں میں اپنے عمدہ اخلاق واطوار کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے۔ اس لیے نصیحت وتلقین بڑی مؤثر ہوتی۔ ان کی باتوں میں بڑا وزن تھا۔ ان کی صحبت میں جو بیٹھتا اس کے قلب میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوتی۔

تقویٰ:

ایمان وخوفِ آخرت نے خداترسی وتقویٰ کی ان کے اندر ایسی صفات پیدا کردی تھی کہ وہ ہمیشہ رزقِ حلال کے لیے کوشاں رہتے۔ مشتبہ اور مشکوک امور سے پرہیز کرنا گویا ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ آپ احتیاط کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ چاہے اس کے لیے جس قدر بھی تکلیف اُٹھانی پڑے۔ اسی سبب سے آپ اپنی غذا خود محنت سے حاصل کرتے اور چونکہ ان کے والدِ محترم حکومتِ وقت کی جانب سے قضا کے منصب پر مامور تھے اس لیے ان کے یہاں کھانے سے احتیاط رکھتے تھے۔ عرصہ کے بعد آپ کے والدین کو اس معاملے کی خبر ہوئی اور والد کے استفسار پر آپ نے عرض کیا کہ آپ قاضی ہیں اور بہت ممکن ہے کہ ملازمین آپ کے لین دین میں مشتبہ امور کا خیال نہ کرتے ہوں۔ تو آپ کے والد قاضی نصر اللہ نے کہا کہ جانِ پدر! تم کو یقین رکھنا چاہیے کہ میں ہمیشہ تقویٰ کی زندگی بسر کرتا ہوں اور ہر معاملے میں کمال احتیاط رکھتا ہوں۔ اور غالباً اسی کا صلہ ہے کہ تمہارا جیسا فرزند خدا نے مجھے عنایت فرمایا جو میرے ہی طرح کمال درجہ محتاط ہے۔[1]

[1]: احوال شاہ وجیہہ الدین، عبد المنعم باعکظ۔

حق گوئی و بے باکی:

آپ کے اندر حق گوئی کی صفت بھی بدرجۂ اتم تھی۔ اس سلسلے میں نہ تو آپ نے کبھی بڑوں کی پرواہ کی اور نہ چھوٹوں کی۔ ہمیشہ سچائی اور راست بازی سے کام لیتے خواہ اس سلسلے میں کتنا ہی نقصان اُٹھانا پڑتا۔ آپ کو اپنی حق گوئی کے سبب بڑے بڑے خطروں میں بھی مبتلا ہونا پڑا۔ اکثر اوقات لوگ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھ جاتے اور بوقتِ ضرورت لے جاتے۔ اس طرح آپ کے مکان میں قیمتی امانتوں کا خزانہ جمع ہو گیا تھا۔ ۹۸۱ھ کی بات ہے کہ ایک عجیب واقعہ ظہور میں آیا۔ اس محلہ میں ایک مفلس مغل رہتا تھا جس کی ملاقات اسی خانوادہ کی خادمہ سے تھی۔ ایک دن اس خادمہ نے اس راز سے آگاہ کر دیا۔ اس مغل نے کوتوال شہر کو اس شرط پر بتانے کا وعدہ کیا کہ اس میں سے کوئی حصہ اس کا بھی مقرر کیا جائے۔ کوتوال شہر نے اپنے وزیر (نائب) امیر علاء الدین کو تحقیقات کے لیے بھیجا جس نے مکان سے قیمتی موتی، بہترین جواہرات، مرصع زیورات اور بے شمار سونے کے سکے برآمد کیے۔ واپسی کے وقت شاہ صاحب کو اپنے گھوڑے کے آگے پیدل دیوان تک لایا اور گھوڑے کے تیز چلنے سے آپ کو بھی بہ تکلف تیزی سے قدم بڑھانے پڑے۔ عوام اور خواص نے یہ منظر دیکھا تو انھیں بہت دکھ ہوا۔ دیوان میں بڑے بڑے اُمراء تھے جن کو مطلق اس واقعہ کی اطلاع نہ تھی۔ چنانچہ جب مجلس کے کنارے جناب شاہ صاحب پہنچے تو سیّد میران بخاری، مرزا مقیم، سیّد جیوا عبدالرحمٰن اور شاہ ابوتراب شیرازی وغیرہ تعظیماً سب کھڑے ہوگئے۔ اور ان کو دیکھ کر تمام امرائے مغل نے بھی تقلید کی۔ سیّد میران بخاری (شیخ فرید بخاری) نے شاہ صاحب کو اس حال میں دیکھا تو غیرت سے پانی پانی ہوگئے۔ پھر جو اصل حقیقت معلوم ہوئی تو غصّے سے شیر کی طرح بپھر پڑے۔ غصّے سے چہرے کا رنگ اس قدر متغیر تھا کہ لوگوں نے محسوس کیا۔ جب شاہ صاحب سے حاکم نے سوالات کرنے کا ارادہ کیا تو سیّد مذکور آپ کے بغل میں آکر بیٹھ رہے تا کہ بوقتِ ضرورت ہر طرح کی مدد کر سکیں۔ ان حالات کو دیکھ کر حاکم نے بھی صرف ایک سوال پر اکتفا کیا کہ ''منادی نے شہر بھر میں جو ڈھنڈورا پیٹا اس کی خبر آپ کو نہیں ملی؟'' مطلب یہ تھا کہ سرکار کی طرف سے عام طور پر مشتہر کر دیا گیا تھا کہ کوئی باغی کو پناہ نہ دے اور نہ اس کی مدد کرے۔ اور نہ اس کا مال و اسباب اپنے پاس رکھے بلکہ

اس قسم کا تمام مال سرکاری خزانے میں داخل کرے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''اول تو مجھ کو اس کا علم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شریعت میں یہ جائز نہیں ہے کہ امانت کو ظاہر کر کے ضائع کیا جائے۔'' حاکم نے اس جواب کے بعد آپ کو رخصت کر دیا۔ سیّد حامد بخاری اپنی خاص سواری پر آپ کے ساتھ مسجد تک تشریف لائے اور کچھ دیر بیٹھ کر آپ کو تسلی و تشفی دیتے رہے اور پھر رخصت واپس گئے۔ حضرت شاہ صاحب کا قلب اس ناگوار واقعہ سے کئی دن تک مضطرب رہا اور درس ملتوی کر دیا۔''[1]

مصنف ظفر الوالہ اس واقعہ کے بعد لکھتا ہے کہ ایک نیک بخت آدمی سے کسی نے کہا کہ تمھارا لڑکا گر گیا۔ یہ سن کر اس نے بڑا واویلا مچایا۔ لوگوں نے اس کی تسلی کے لیے کہا کہ وہ بہت اونچے سے نہیں گرا ہے۔ تب اس نے کہا کہ اگر وہ بہت اونچے سے بھی گرتا تو مجھے اتنی پرواہ نہیں ہے۔ میں تو سمجھا کہ کسی اہل اللہ کی نظر سے گر گیا۔ یہی حال اس واقعہ میں ہوا کہ وزیر میر علاء الدین کچھ ہی دنوں کے بعد اسی حاکم کے ہاتھ سے رسّی سے بندھوا کر مارا گیا۔ اور وارثوں کی فریاد پر خود حاکم قصاص میں قتل ہوا اور مرزا عزیز کوکلتاش ملقب بہ خان اعظم جو اس صوبہ کا حاکمِ اعلیٰ تھا، معتوب سلطانی ہو کر ایک باغ میں گوشہ نشیں ہوا۔

اسی طرح جب ۹۷۵ھ میں چنگیز خاں (جو عماد الملک کا لڑکا تھا اور عماد الملک امرائے محمودی میں سے تھا) نے محرم کی رسم ماضی کے سلاطین کے برخلاف سرکاری طور پر منائی اور ہر قسم کی بدعتیں جاری کیں اور سیاہ ماتمی لباس زیب تن کر کے ننگے پاؤں اور ننگے سر تعزیہ کے ساتھ بازاروں میں گشت لگایا تو باوجود اس کے کہ تمام سادات، علماء اور امراء نے اس کو سخت ناپسند کیا اور عوام نے اس کو بہت ہی برا سمجھا مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس کے خلاف زبان کھولے۔ حضرت شاہ صاحب ہی وہ شخص تھے جنھوں نے عوام و خواص کی ترجمانی کر کے صدائے احتجاج بلند کی۔ اور چونکہ اس وقت احمد آباد میں سوائے الغ خاں کے کوئی امیر با اثر نہ تھا اس لیے الغ خاں کے پاس آدمی بھیج کر اس کی شکایت کی۔ چنانچہ دوسرے ہی مہینے چنگیز خاں کا کام تمام کر دیا گیا۔[2]

ا: ظفر الوالہ بمظفر و آلہ، جلد دوم، ص: ۶۰۵، مطبوعہ لندن۔ ۲: ظفر الوالہ، جلد دوم، صفحہ ۵۱۲، مطبوعہ لندن۔

رحم دلی:

حضرت شاہ صاحب بڑے رحم دل تھے۔ جب بھی ایسا واقعہ پیش آتا جہاں آپ کچھ کرسکتے تو ہرگز دریغ نہ فرماتے۔ ایک دفعہ اتفاقاً ایک جگہ سے گزرے۔ دیکھا کہ ایک قیدی کو قتل کے لیے لے جارہے ہیں۔ اس نے آپ سے رہائی کے لیے التجا کی اور اس کی حالت کو ملاحظہ کرکے آپ نے لوگوں سے تحقیقات کرائی۔ معلوم ہوا کہ واقعی یہ شخص بے گناہ ہے اور اصل مجرم کوئی دوسرا ہے۔ چنانچہ آپ نے فوراً بادشاہِ وقت سے سفارش کی اور بادشاہ نے یہ کہہ کر فوراً رہائی کا حکم صادر فرمایا کہ یہ شخص تو بے گناہ ہے۔ اس کو تو رہا ہونا ہی چاہیے لیکن اگر آپ مجرم کی سفارش فرماتے تو بھی میں رہا کردیتا۔

مظلوم کی فریادرسی:

چونکہ آپ فطرتاً رحم دل واقع ہوئے تھے اس لیے جب کوئی مظلوم نظر سے گزرتا اور آپ اس کی مدد فرماسکتے تو کبھی دریغ نہ فرماتے اور حتی الامکان اس کے ساتھ سلوک کرنے اور اس کی حاجت روائی میں سعیٔ بلیغ فرماتے۔ ایک مرتبہ کچھ غریب عورتیں آپ کے پاس حاضر ہوئیں اور فریاد کی کہ میرے کچے مکانات حکام گرادینا چاہتے ہیں۔ ہم غریب پکے عالی شان مکانات کیونکر تعمیر کریں۔ آپ نے تمام حالات سن کر ایک خط بادشاہِ وقت کو لکھا جس کو دیکھ کر بادشاہ نے ان مکانات کو شاہی خرچ سے تعمیر کروادیا۔

اسی طرح چنگیز خاں نے طوائف الملوکی سے فائدہ اُٹھا کر ۹۷۴ھ میں احمد آباد پر قبضہ کرلیا اور دولت وسلطنت سے مخمور ہوکر حرمِ سلطانی پر دست درازی کرنی چاہی اور بیگمات نے حضرت شاہ صاحب سے فریاد کی تو چونکہ اس وقت کوئی کسی کی سنتا نہ تھا اور ہر امیر کوسِ لمن الملک بجارہا تھا اس لیے دفعِ ظلم کے واسطے بادشاہِ حقیقی (خدا) سے دعا فرمائی جو فوراً مستجاب ہوئی۔ چنگیز خاں چند ہی دنوں کے بعد مارا گیا اور مظلوموں نے نجات پائی[1]۔

۱: مقالہ مولانا ابوظفر ندوی، معارف، فروری ۱۹۲۳ء۔

خوشامد سے پرہیز:

یہ انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی شخص علوِ ہمتی سے اونچے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے تو کچھ لوگ اس کے مخالف اور کچھ اس کے خوشامد کرنے والے پیدا ہوجاتے ہیں۔ حضرت شاہ وجیہ الدین کے عہد میں بھی یہ دونوں گروہ موجود تھے۔ مخالفوں نے تو آپ کو اکبرِ اعظم کے دربار تک بحیثیت ایک مجرم کے بلوایا اور خوشامد کرنے والوں کی آنکھوں نے آپ کی ذات میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ دیکھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک صاحب تشریف لائے اور آپ سے مل کر برجستہ یہ شعر پڑھا

نمی دانم کہ ایں ذات وجیہ الحق و الدین است
کہ باذاتِ خداوند تعالیٰ صورت این است

(مجھے نہیں معلوم کہ یہ وجیہ الدین کی ذات ہے یا اللہ تعالیٰ کی ذات اس صورت میں ہے۔)

شاہ صاحب نے سنا تو اس سے فرمایا کہ ”حال بدست آر، این قال را بگذار“ یعنی حال پیش کر اور یہ گفتگو چھوڑ دے۔ کاش آجکل کے صوفیاء ومرشدین بھی اپنے مریدین کو اسی قسم کی تعلیم دیا کریں تو بے اعتدالی سے مسلمان اکثر اوقات محفوظ رہیں[1]۔

تکفیر سے اجتناب:

بعض مواقع ایسے آتے ہیں کہ علماءِ حق کو الحاد، زندقہ اور گمراہ کن خیالات سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے تکفیر کا حربہ استعمال کرنا پڑتا ہے مگر یہ کوئی محبوب اور دل پسند مشغلہ نہیں ہے بلکہ بدرجۂ مجبوری اختیار کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہر زمانے میں علماءِ کرام کا اچھا خاصا طبقہ محض نفسانیت یا بغض وحسد کی بنا پر اس سے دلچسپی لیتا رہا ہے۔ کبھی ذاتی عناد یا معاصرانہ چشمک بھی اس کا سبب بنتی رہی ہے۔

شاہ محمد غوث گوالیاری کے خلاف بھی فتویٰ لکھا گیا مگر اس میں علماء کو زیادہ تر غلط فہمی ہوئی۔ اس میں ان کی بدنیتی کو دخل نہ تھا۔ پھر شیخ علی متقی جیسے برگزیدہ عالمِ ربانی کے بارے میں تو یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے یہ قدم کسی دشمنی کی بنا پر اُٹھایا ہو۔ اس سلسلے میں شاہ

۱: رسالہ معارف، فروری ۱۹۲۳ء۔

وجیہہ الدین نے نہ صرف فتوے پر دستخط نہیں کیے بلکہ بڑے پتے کی بات کہہ کر اپنے شیخ اور شیخ علی متقی دونوں کی پوزیشن صاف کردی:

''نظر بظاہر شریعت چناں باید بود کہ شیخ علی متقی است و در حقیقت آنچناں کہ مرشد ماست[1]'' (ظاہر شریعت پر ایسی نظر ہونی چاہیے جیسی شیخ علی متقی کی ہے اور حقائق پر ایسی جیسی ہمارے پیر (شیخ محمد غوث) کی نظر ہے۔)

ایک مرتبہ فرمایا کہ: ''باطن شیخ محمد غوث باید وظاہر شیخ علی متقی[2]''

اسی طرح ان کے زمانے میں سید محمد جونپوری کی تحریک مہدویت شروع ہوئی۔ اس میں احیاءِ شریعت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور ہجرت، ترکِ وطن، ترکِ جان وترکِ مال پر بڑا زور تھا۔ ان کی دعوت وتذکیر میں ایسی تاثیر تھی کہ ہزاروں آدمی حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ ان کے پیروؤں کے طور وطریق عجیب عاشقانہ ووالہانہ تھے۔ ان کے مریدوں میں سے شیخ نیازی اور شیخ علائی نے جو بلند کردار پیش کیا اور قربانیاں دیں اس کو کون نظر انداز کرسکتا ہے۔ سیّد مہدی کے دعویٰ مہدویت کو جہاں بعض علماء نے ناپسند کیا اور اس کے خلاف صف آرا ہوگئے وہاں بعض شخصیتیں ایسی بھی تھیں جنھوں نے تاویل کی راہ اختیار کی اور ان کی طرف منسوب کلمات کو حالتِ سکر وجذب کے شطحیات پر محمول کیا۔ اور وہ سیّد محمد اور ان کی جماعت سے حسنِ ظن رکھتے یا اقلاً ان کے بارے میں توقف اور سکوت کو کام میں لاتے تھے۔ شیخ داود جہنی وال، مولانا جمال الدین دہلوی کی طرح شاہ وجیہہ الدین کا طرزِ عمل بھی ان کے بارے میں ایسا ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان کے سامنے سیّد موصوف اور ان کے بعض اتباع کی تکفیر کا فتویٰ پیش کیا گیا تو دستخط کرنے سے انکار کردیا[3]۔ سیّد محمد جونپوری کے سلسلے میں ابوالکلام آزاد نے بڑی اچھی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں:

۱: منتخب التواریخ۔
۲: ملفوظات۔
۳: علماءِ ہند کا شاندار ماضی۔ مصنفہ مولانا سیّد میاں۔

''بڑی وقت ان لوگوں کو معانی کی فراوانی ووسعت، اور الفاظ کی تنگنائی ونامساعدت سے پیش آتی ہے۔ ناچار ہنگامِ تعبیر وبیان جو الفاظ سامنے آجاتے ہیں انھی سے کام لینا پڑتا ہے۔ نافہموں کے لیے وہ الفاظ فتنہ بن جاتے ہیں۔ مقلدین ومعتقدین ان کو حجت گردانتے ہیں اور منکرین ومتعصبین آلۂ انکار وتکفیر۔ لیکن اربابِ حق واقتصاد یا تو ان کی تاویل کرتے ہیں یا ان کے معاملے کو عالم السرائر کے حوالہ کردیتے ہیں۔ البتہ عمل واعتقاد ہر حال میں احکامِ شریعت و ظواہرِ نصوص وکتاب وسنت پر ہے۔ اور ان کے سوا کوئی نہیں جو معیارِ حق و باطل اور حجت وبرہان ہو[1]''

بلا شبہ بعد میں فرقہ مہدویہ میں غلو اور بدعات نے بار پایا اور اس میں بڑی گمراہ کن باتیں شامل ہوگئیں جس کا رد اس زمانے کے علماءِ حق میں سے شیخ علی متقی اور شیخ طاہر پٹنی وغیرہ نے کیا۔ اس سلسلے میں شاہ وجیہہ الدین کے ملفوظات میں بھی ذکر آیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''فرقہ مہدویہ عجب جاہلانند کہ اعتقادِ ایشاں آنکہ ہر کہ بہ گرسنگی میرد ہماں بزرگ۔ می فرمودند کہ بدتر از روافض اند۔ می فرمودند کہ بعضے آشنایاں کہ میل بہ عقیدۂ مہدویہ داشتند و بر آں عقیدہ مردند توجہ کردم تا بر احوال ایشاں مطلع شوم۔ احوال ایشاں را بغایت بدیدم[2]''

یعنی فرقۂ مہدویہ کے لوگ عجب جاہل ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ جو شخص بھوک کی حالت میں مرجائے تو وہ بزرگ ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہ لوگ روافض سے بھی بدتر ہیں اور بعض لوگ جن سے میرا تعلق رہا ہے وہ عقیدۂ مہدویہ کی جانب رجحان رکھتے ہیں اور اسی عقیدے پر ان کا خاتمہ ہوا۔ میں نے جب ان کے احوال کی طرف توجہ کی تاکہ ان کے متعلق حالات سے آگاہی حاصل کروں تو میں نے انھیں بری حالت میں پایا۔

لیکن جہاں تک تکفیر کا تعلق ہے تو ہمیشہ احتیاط کا پہلو اختیار کرتے اور جہاں تک ممکن ہوتا اس سے اجتناب فرماتے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا۔ میری نظر سے تو

۱: تذکرہ۔ صفحہ: ۳۳۔
۲: ملفوظات قلمی، نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ۔

نہیں گزرا لیکن مولانا ابوظفر ندوی لکھتے ہیں کہ چھوٹی تقطیع پر بیس صفحے کا قلمی رسالہ ہے جس میں ابتداءً فقہی کتابوں سے مسئلۂ تکفیر پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر احادیث سے سنداً سب کو مشرح کیا ہے۔ آخر میں صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی ہے کہ حالتِ سکر میں جو کہہ جاتے ہیں وہ قابلِ مواخذہ نہیں ہوتا۔ اور اس کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ پھر سید محمد غوث گوالیاری کی کتاب 'اورادِ غوثیہ' پر لوگوں نے جو اعتراضات کیے تھے ان کا جواب دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہزاروں فتوے آپ کے قلم سے نکلے مگر کسی فتوے میں آپ نے اس طرف اشارہ نہیں کیا۔ آپ کا ارشاد یہ تھا کہ کسی شخص میں سو باتوں میں سے ایک بات بھی اگر اسلام کی ہو تو اس کو مسلم سمجھو اور کسی کلمہ گو، اہلِ قبلہ کو کافر نہ کہو[1]۔''

فقہی مسلک میں وسعت :

شاہ وجیہہ الدین تبحرِ علمی اور اپنی اجتہادی بصیرت کی بنا پر گروہی عصبیت سے بہت دور تھے۔ وہ فقہی مسلک اور فروعی مسائل میں بڑے روادار اور توسیع پسند تھے۔ ان کے اساتذہ میں شیخ محمد مالکی تھے اور تلامذہ میں بھی دوسرے مسلک کے طلبہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قرأت خلف الامام کے مسئلے میں امام شافعی کے پیرو تھے۔ مشکوٰۃ النبوت کے مصنف رقم طراز ہیں کہ:

''شاہ محمد مدرس گوید کہ شیخ وجیہہ الدین مجتہد فی المذہب بود کہ در بعضے مسائلِ فقہ عمل بر اجتہادِ خودمی کردند۔ حنفی بودند لیکن در حالِ اقتدا با امام قرأت می نمودند چنانچہ مسئلہ شافعی است[2]۔''

شاہ محمد مدرس کہتے ہیں کہ شیخ وجیہہ الدین مجتہد فی المذہب تھے۔ بعض مسائلِ فقہ میں وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرتے تھے۔ وہ باوجودیکہ حنفی تھے لیکن مقتدی ہونے کی حالت میں امام کے ساتھ قرأت کرتے تھے جیسا کہ امام شافعی کا مسلک ہے۔

انسان کے اچھے پہلو پر نظر :

شاہ صاحب کی ایک صفت اور بھی محمود و پسندیدہ تھی۔ وہ انسان کے عیوب پر کم نظر ڈالتے تھے۔ ہمیشہ اس کی اچھائیوں اور خوبیوں کو دیکھتے۔ وہ عیب جوئی، نکتہ چینی اور دل آزاری

[1] رسالہ معارف، فروری ۱۹۳۳ء۔
[2] مشکوٰۃ النبوت قلمی۔ مصنف علی محمد موسوی۔ باب بست وسیوم۔

کے بجائے اس کی زندگی کے اچھے پہلو کو دیکھتے اور حوصلہ افزائی فرماتے۔ گویا وہ عیب میں بھی ہنر کا پہلو تلاش کر لیتے تھے۔ محمد حسن غوثی کہتے ہیں کہ:

''ایک روز اثنائے درس میں ایک طالب علم نے اس وقت کے ایک جاگیردار کا حال بیان کرنا شروع کیا اور شیریں عبارت سے اس کی تنگ دلی، کوتاہ دستی، امساک اور بخل ظاہر کیا۔ آپ نے فرمایا یہ اس کی صفت سب لوگوں کے واسطے عموماً اور خدا پرستوں کے واسطے خصوصاً اچھی ہے کیوں کہ وہ اس صفت کے ذریعے دلوں کی محافظت، طمع، طلب، خواہش اور آرزو پیدا ہونے سے کرتا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے، مصرع: نازنیں جملہ نازنیں بیند[1]۔

پوشاک میں سادگی :

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ خودنمائی، زیب و زینت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ نہ علماء کرام کی طرح عبا، جبہ اور شان و شوکت کا اظہار اور نہ ریاکار زاہدوں کی طرح دلق پوشی اور بدہیئتی، بلکہ ہمیشہ سادہ، کم خرچ اور عوامی لباس زیب تن فرماتے۔ جس سے ان کو عالمانہ حیثیت سے پہچاننا بھی دشوار ہوتا۔ ملا عبدالقادر بدایونی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''در لباس و وضع ہیچ امتیاز از احاد الناس نداشتہ بجامۂ درشت اکتفامی کرد[2]۔''

یعنی وضع و لباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ موٹے جھوٹے کپڑوں ہی پر قانع رہتے تھے۔

بدایونی نے جس کو 'جامۂ درشت' لکھا ہے دراصل وہ گاڑھا یا کھدر کا موٹا کپڑا ہے جو حضرت شاہ وجیہہ الدین کا پسندیدہ کپڑا تھا اور اسی زمانے سے گجرات میں کھدر پہننے کی ابتدا ہوئی۔ یہ عام طور سے احمد آباد میں تیار ہوتا تھا۔ گاندھی جی نے بھی اسی لباس کو قومی لباس قرار دیا اور تحریک آزادی میں حریت پسندوں کا یہ خاص لباس رہا۔ ایک گجراتی اسکالر چندر پرمار نے حضرت شاہ وجیہہ الدین کی سوانح عمری گجراتی زبان میں لکھی ہے جس میں وہ تحریر کرتے ہیں:

[1] گلزارِ ابرار۔
[2] منتخب التواریخ۔

''شاہ وجیہہ الدین بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ بالکل فقیرانہ طریقے پر رہتے تھے۔ اسلامی شریعت میں چونکہ علماء اور اولیاء کو ریشمی اور قیمتی کپڑے پہننے کی ممانعت ہے اس لیے شاہ صاحب کھادی کے کپڑے پہنتے تھے۔ اُس وقت کسی کو کیا خبر تھی کہ وہی کھادی احمد آباد سے نکل کر ہندوستان کی تحریک آزادی میں کام آئے گی اور ہندوستان کے آزادی پسند و قوم پرست لیڈروں کا پسندیدہ لباس یہی بنے گا اور اسی کپڑے سے ہندوستان کا پرچم تیار ہوگا جس کو لوگ سلامی دیں گے[1]۔''

خدمتِ خلق:

حضرت شاہ وجیہہ الدین کی بڑی خصوصیت جس کا تمام تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے وہ ہے خدمتِ خلق۔ ''خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَنْفَعُ النَّاسَ'' یعنی لوگوں میں اچھا وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے، ان کے ہمیشہ پیشِ نظر رہا۔ عام لوگ ہوں یا خواص سب ان سے مستفیض ہوتے۔ درس و تدریس کا مشغلہ ہو یا ارشاد و ہدایت، تصنیف و تالیف ہو یا وعظ و نصیحت، مریضوں اور حاجت مندوں کے لیے دعائے خیر، کمزوروں اور مظلوموں کی حمایت ہو یا ان کی سفارش، ان کی پوری زندگی خدمتِ خلق اور افادۂ عام میں گزری۔ بقول بدایونی: ''اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا میں بڑا اثر دیا تھا۔ جلد کارگر ہوتی تھی۔ چنانچہ ہر روز بے شمار مریض ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آتے تھے اور شفایاب ہوتے تھے[2]۔'' رحمان علی کہتے ہیں کہ انھیں جو کچھ نذر و فتوحات ملتی وہ سب دوسروں پر خرچ کر دیتے تھے[3]۔ طبقاتِ شاہجہانی کا مصنف ہو یا بحرِ ذخار کا مؤلف سب نے ان کو مظہر اسم شافی گردانا ہے اور سب لکھتے ہیں کہ ہر روز بیماروں کا ایک جم غفیر ان کے آستانے پر حاضر ہو کر آپ کے انفاسِ متبرکہ سے فیضیاب ہوتا۔ اس مناسبت سے روضۃ الاولیاء کے مصنف ابراہیم بیجاپوری فرماتے ہیں:

[1] حضرت شاہ وجیہہ الدین گجراتی (گجراتی)۔
[2] منتخب التواریخ۔
[3] تذکرہ علمائے ہند۔

مسیحی ہر دم از فیض زباں با
زدہ ہر مردہ جاناں فیض جاں با
بہر سوئے کہ او الحمد خواندہ
اجل از کاروائی باز ماندہ

ترجمہ:

مسیح ہر دم کہ جو فیض زبان سے
کہ زندہ مردہ جانوں کو بنائے
جدھر دم کردے وہ الحمد پڑھ کے
اجل بھی باز آجائے وہاں سے[1]

[1] روضۃ الاولیاء بیجاپور۔

معاصرین سے تعلقات

حضرت شاہ وجیہ الدین کے دور میں بہت سے انقلابات آئے۔ شاہانِ گجرات کی حکومت کا زوال اور مغلیہ سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ سیاسی طور پر جہاں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں وہیں علمی و دینی فضا میں بھی تغیرات ہوئے۔ لیکن شاہ صاحب ان لوگوں میں تھے جنھوں نے مدرسہ و خانقاہ سے ہٹ کر کسی اور کام سے دلچسپی نہیں لی اور نہ وہ احمد آباد سے کہیں باہر تشریف لے گئے۔ ان کے دور میں جلال الدین اکبر کا دربار وقت کے علماء و فضلاء اور اربابِ کمال کا مرکز بنا ہوا تھا لیکن آپ نے اس کی طرف رُخ بھی نہ کیا اور نہ دربار و سرکار سے واسطہ رکھا۔ آپ کا زیادہ تر تعلق احمد آباد اور گجرات کے خاص خاص علماء و صوفیاء سے رہا۔ اس لحاظ سے کہنا چاہیے کہ آپ کے تعلقات کا دائرہ محدود رہا۔ آپ کے دور میں گجرات میں علماء و فضلاء کی اچھی خاصی تعداد رہی۔ اور ان سے آپ کے تعلقات نہایت خوشگوار رہے۔ مشاہیر میں آپ کے استاد بھائی قاضی علاء الدین عیسیٰ گجراتی ہیں جو آپ ہی کی طرح درسیات میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ مولانا علاء الدین نہروالی متوفی ۹۴۹ھ ہیں جو حدیث کے نامور استاد تھے۔ شیخ ابوصالح حسن محمد گجراتی متوفی ۹۸۲ھ ہیں۔ مفتی قطب الدین نہروالی مصنف برق الیمانی متوفی ۹۹۹ھ ہیں۔ شیخ عبدالقادر حضرمی مصنف النور السافر متوفی ۱۰۳۸ھ ہیں۔ مشہور تاریخ ظفر الوالہ کے مصنف محمد بن عمر آصفی ہیں۔ میر ابوتراب متوفی ۹۹۹ھ ہیں۔ سید عبدالاول شارح بخاری متوفی ۹۶۸ھ کے

متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک مدت تک احمد آباد میں رہے اور آپ سے استفادہ بھی کیا۔ مگر معاصرین میں چند ہستیاں ایسی ہیں جن سے خاص تعلقات کا پتہ چلتا ہے اور جس کا ذکر بعض تذکرہ نگاروں نے بھی کیا ہے۔

شیخ علی متقی سے تعلقِ خاطر:

انھی میں خصوصیت کے ساتھ گجرات کے جلیل القدر محدث شیخ علی متقی ہیں جن سے آپ کے خاص روابط تھے۔ شیخ علی متقی کو علمِ حدیث سے خاص شغف تھا اور باوجودیکہ وہ چشتی و شاذلی تھے لیکن اتباعِ سنت میں بہت امتیاز تھا۔ آخری دم تک وہ تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی مشہور کتاب 'جمع الجوامع' پر نظرِ ثانی فرمائی اور مکرر احادیث کو علیحدہ کر کے اس کا انتخاب مرتب کیا جو 'کنز العمال' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب سے جمع الجوامع کی افادیت میں اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ آپ کے متعلق شیخ ابوالحسن بکری کا قول ہے کہ "لِلسُّيُوطِيِّ مِنَّةٌ عَلَى الْعَالَمِيْنَ وَ لِلْمُتَّقِي مِنَّةٌ عَلَيْهِ" یعنی سیوطی نے تمام عالم پر احسان کیا ہے اور متقی نے سیوطی پر۔

شیخ علی متقی گجرات سے حرمین شریفین ہجرت کر کے چلے گئے لیکن جب تک آپ کا قیام گجرات میں رہا شاہ وجیہ الدین سے ان کے خاص تعلقات رہے اور دونوں ایک دوسرے کے مرتبہ شناس رہے۔ شاہ محمد غوث گوالیاری گجرات میں وارد ہوئے تو ان کی مخالفت میں شیخ علی متقی پیش پیش رہے اور اس سلسلے میں شاہ صاحب سے آپ کا اختلافِ رائے بھی ہوا۔ لیکن وہ تعلقِ خاطر ہی کی بنا پر شاہ صاحب کے گھر پر جا کر بطورِ احتجاج اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ شاہ صاحب ان کے تقویٰ، حمایتِ دین اور خلوص کے معترف رہے اور اس سلسلے میں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ شاہ صاحب کے ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ جب کبھی شیخ علی متقی کا ذکر کرتے تو نہایت اچھے الفاظ میں کرتے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

> ''شیخ علی متقی فرشتہ بود بصورت انسان، مثل او متقی بر روئے زمین نادر است۔ اما شیخ علی کا تقویٰ کہاں اور میرا مقام کہاں۔'' (ملفوظات نمبر ۸)

یعنی شیخ علی متقی انسان کی شکل میں فرشتہ تھے۔ ان جیسا پرہیزگار روئے زمین پر ہونا عجب

ہے۔ بھلا ان کا تقویٰ کہاں اور میرا درجہ کیا۔ میرا مقام کہاں۔ (ملفوظات نمبر ۸)

شیخ محمد بن طاہر پٹنی سے تعلق اور خیر خواہی:

گجرات کے سب سے نامور محدث علامہ محمد بن طاہر پٹنی متوفی ۱۵۷۸ء ہیں۔ ان کی کتاب 'مجمع بحار الانوار' حدیث کی نہایت اہم کتاب ہے اور گویا صحاح ستہ کا سب سے مستند لغت اور شرح ہے۔ وہ صرف عالم ہی نہیں بلکہ مبلغ اور قاطعِ بدعت بھی تھے۔ چونکہ وہ قوم کے بوہرے تھے اس لیے ان کی کوشش تھی کہ اپنی قوم سے تمام بدعتیں دور کردیں۔ چنانچہ انھوں نے عہد کیا کہ جب تک میری قوم تمام بدعتوں اور ضلالتوں سے بری نہ ہوجائے گی میں سر پر عمامہ نہ باندھوں گا۔ وہ اپنی کوششوں میں مشغول تھے کہ اکبر نے گجرات فتح کرلیا اور بادشاہ کے سامنے دوسرے علماء کے ساتھ وہ بھی پیش ہوئے۔ بادشاہ نے برہنہ سر رہنے کی وجہ دریافت کی اور جب انھوں نے حقیقتِ حال بیان کی تو اکبر نے خود ان کے سر پر عمامہ باندھا اور کہا کہ دین کی حفاظت میرا فرض ہے۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ اور میں اس میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ چنانچہ خان اعظم گجرات کا گورنر مقرر ہوا اور چونکہ وہ راسخ العقیدہ سنی تھا اس نے اپنے ایام حکومت میں شیخ کی پوری مدد کی۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ تبدیل ہوگیا اور اس کی جگہ عبدالرحیم خانخاناں گورنر ہوا جس کے عہدِ حکومت میں شیعہ بوہرے پھر دلیر ہوگئے۔ شیخ نے اپنا عمامہ پھر سر سے اُتارا اور آگرے کا رُخ کیا تا کہ خود بادشاہ کے حضور میں عرضِ حال کریں۔ شاہ وجیہہ الدین نے آپ کو اشارہ و کنایہ سے منع کیا لیکن آپ اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔ (شیخ وجیہہ الدین علوی ہر چند بہ طریق کنایہ منع کرد فرمود کہ عالم مظہر اسمائے جمالی وجلالی است حفظ آثار و مکارم ہر اسے صراطے است مستقیم، سودمند نیفتاد۔)

آپ ابھی راستے ہی میں تھے کہ اُجین کے قریب چند مخالف پیچھے سے آپہنچے اور انھیں شہید کردیا۔ ان کے ساتھی ان کی لاش کو پٹن واپس لے گئے اور بزرگوں کی قبرستان میں دفن کردیا[1]۔

[1] رودِ کوثر، صفحہ: ۳۹۲،۳۹۳

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ملاقات اور استفادہ:

ہندوستان کے مشہور محدث اور نامور عالم شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۹۹۶ھ مطابق ۱۵۸۷ء میں جبکہ ان کی عمر اڑتیس سال کی تھی حج کی غرض سے حجاز چلے تو مالوہ ہوتے ہوئے گجرات پہنچے۔ احمد آباد میں مرزا نظام الدین احمد بخشی مصنف طبقات اکبری جو اُن کے دیرینہ دوست تھے، ان کو اپنے یہاں ٹھہرایا۔ احمد آباد کے دورانِ قیام میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی شیخ وجیہہ الدین علوی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اپنی کتاب اخبار الاخیار میں خود لکھتے ہیں:

''محرر سطور در وقتیکہ بہ قصدِ زیارت سیّد کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بہ احمد آباد گجرات رسید از متاخرین مشائخ آن دیار کہ شیخ وجیہہ الدین جامع کمالات و برکات وحسن ومعمر ومرتاض مشغول بہ تدریس علوم وتصنیف کتب وترتیب وارشادِ طالبان بود بملاقاتِ وے مستعد شد و بہ بعضے از کار و اشغال بسلسلۂ عالیہ قادریہ مشرف گردید[1]''

محررِ سطور جب سیّد کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے ارادے سے احمد آباد گجرات پہنچا تو اس وقت اس دیار کے مشائخ متاخرین میں شیخ وجیہہ الدین جو جامع کمالات و برکات، سن رسیدہ بزرگ تھے درس و تدریسِ علوم میں مشغول تھے۔ کتابوں کی تصنیف و ترتیب اور ارشادِ طالبان میں ان کی سرگرمی تھی۔ ان کی ملاقات کی سعادت حاصل کی اور سلسلۂ عالیہ قادریہ کے کچھ اذکار و اشغال ان سے حاصل کیے۔

[1] اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی، ص: ۱۶۳۔

فضل وکمال کا اعتراف

صاحبِ کمال جس حال میں ہو یا جس رنگ میں ہو گمنام نہیں رہ سکتا۔ جوں جوں اس کے کمالات وسیع ہوتے جاتے ہیں اسی قدر اس کی عظمت اور حلقۂ اثر بھی بڑھتا جاتا ہے۔ مخلص اور بے ریا انسان چاہے خانقاہ کے گوشے میں رہے یا مدرسے کی چہار دیواری میں، اس کی کشش ایک عالم کو اپنے قریب کھینچ لاتی ہے۔ حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کے علمی اور روحانی کمالات ہی تھے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے طالبانِ علوم اور دردمندانِ روحانیت اس مردِ درویش کے آستانے پر حاضر ہوتے اور علمی و روحانی پیاس بجھاتے۔ ان کی شخصیت گوناگوں اوصاف اور محاسن کا مجموعہ تھی۔ دیکھنے میں نہایت سادہ لیکن گفتگو دلکش اور پُر تاثیر، لباس معمولی کھدر کا مگر وقار شاہانہ، خوراک و رہائش فقیروں جیسی، مگر فیاضی و سخاوت میں امیروں کو مات کر دینے والے، صوفی اور درویش مگر شریعت کے دائرے سے کبھی قدم باہر نہ نکالا۔ گوشہ نشیں و عزلت گزیں مگر خلائق کا ہجوم ان کے آستانے پر۔ زندگی میں نہ تو بادشاہوں کے دربار میں حاضری دی اور نہ امراء و حکام کی خوشامد۔ ترسٹھ سال صرف درس و تدریس میں بسر کر دیے۔ علمی فیض رسانی کے ساتھ روحانی برکات سے لوگوں کو مالا مال کیا اور عوام و خواص دونوں نے ان کے خرمنِ کمال سے خوشہ چینی کی۔ وہ جہاں اسلامی علوم و فنون میں تفسیر، حدیث، فقہ کے جید عالم تھے وہاں معقولات میں فلسفہ، منطق، کلام اور ہیئت میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ ان کے طریقۂ درس وطرزِ تفہیم کی خوبیوں کا ہر وہ

شخص قائل تھا جس کو آپ سے استفادہ کا موقع ملا۔ درسیات میں شاید ہی کوئی کتاب ہو جس پر آپ نے شروح و حواشی نہ لکھے ہوں۔ ان کی تصانیف کو جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کم الفاظ میں مطالب کی گرہ کشائی میں آپ کو خاص مہارت تھی۔ پھر یہی نہیں طلبہ کو مستفید کرنے کے ساتھ عوام کے دردِ دل کا علاج بھی کرتے۔ ان کے قلوب کی اصلاح کرتے۔ روحانی امراض کے لیے داروئے شفا بھی مہیا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے فضل و کمال کا اعتراف معاصرین علماء وفضلاء نے بھی کیا اور بعد کے مؤرخین و تذکرہ نگاروں نے بھی۔ سب ان کی جامع شخصیت کے معترف اور ان کے علمی و روحانی اثرات کا نہایت اچھے الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔ آپ کے معاصر مشہور مؤرخ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

> ''میاں وجیہہ الدین احمد آبادی نسبتِ او علویست۔ خود را بجہت غرابت شہرت باین نداد۔ واز علماء کبار روزگار، وصاحب صلاح وتقویٰ ومجاہدہ است۔ و بر جادۂ شریعت مستقیم و در گوشۂ قناعت مقیم۔ دائم بدرس علوم اشتغال داشت۔ و قدرت او در جمیع علوم عقلی و نقلی بمرتبہ بود کہ کم کتاب درس از صرف حاوی یا قانون و شفا و شرح مفتاح و عضدی باشد کہ او شرح یا حاشیہ بران ننوشتہ۔ خلائق را پیوستہ از انفاسِ متبرکہ او فیض میرسد۔ وحق سبحانہ اسم الشافی را ظاہر و را مظہر ساختہ بود۔ تا ہر روز مجمعے لا تعداد و لا تحصیٰ از بیماراں و محنت روزگاراں بملازمت او آمدہ التماسِ دعا و اثر آں زود می یافتند و ہرگز بطور خود بخانۂ اہل دنیا نرفتہ۔ مگر در مدتِ عمر یک دو بار بحسبِ طلب و اکراہ قدم از خانہ ومسجدِ خود برائے نماز جمعہ ہم بیروں نماندہ و خانۂ او مقصدِ اقصیٰ اکابر و اخیار روزگار بود۔ و در لباس و وضع ہیچ امتیاز از احاد الناس نداشتہ، بجامۂ درشت اکتفا می کرد و ہرچہ فتوح می رسید بذل و ایثار می نمود۔'' (منتخب التواریخ، ص:۲۹۲و۲۹۳)

یعنی میاں وجیہہ الدین احمد آبادی علوی نسب سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اپنے نسب کو انھوں نے مسافر ہونے کی وجہ سے شہرت نہ دی۔ اپنے زمانے کے بڑے عابد و متقی عالم تھے۔ شریعت کے راستے پر ہمیشہ گامزن رہنے والے اور قناعت کے گوشے میں رہنا ان کا شعار تھا۔

ہمیشہ دینی علوم کی درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ تمام عقلی و نقلی علوم پر ان کو قدرت و عبور حاصل تھا۔ چنانچہ صرف حاوی سے لے کر قانون و شفا، شرح مفتاح اور عضدی جیسی کتابوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو۔ ایک مخلوق ان کے علمی افادہ سے فیض اُٹھاتی تھی۔ اللہ نے ان کی دعا میں بڑا اثر دیا تھا اور شفا رکھی تھی۔ چنانچہ ہر روز بے شمار مریض ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آتے تھے۔ اور ان کی دعا کا بھی بڑی جلدی اثر ہوتا تھا۔ وہ کبھی اپنے طور پر دنیادار اصحاب کے گھر بھی نہیں گئے۔ بجز ایک دو بار کے اور وہ بھی طلب کرنے پر نہایت کراہیت کے ساتھ۔ اپنے گھر اور مسجد سے ان کا قدم بجز نماز جمعہ کے باہر نہیں نکلتا تھا۔ سب کا مرکز و مرجع تھے۔ وضع و لباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ موٹے جھوٹے کپڑوں ہی پر قانع رہتے تھے۔ جو کچھ نذر و نیاز آتی وہ دوسروں پر خرچ کر دیتے تھے۔

دوسرے مشہور مؤرخ اور آپ کے معاصر خواجہ نظام الدین احمد بخشی لکھتے ہیں:

''میاں وجیہ الدین گجراتی، مدت پنجاہ سال بر جادۂ ارشاد و ہدایت متمکن بود۔ بہ فقر و فاقہ و توکل گذرانیدی و ہمہ وقت درس گفتی۔ علومِ نقلی و عقلی خوب دانستے۔ صاحبِ تصانیفِ شریعہ است۔ بر اکثر کتبِ علمی شروح و حاشیہ نوشتہ۔'' (طبقاتِ اکبری، جلد دویم، صفحہ: ۳۸۳)

میاں وجیہ الدین گجراتی پچاس سال جادۂ ارشاد و ہدایت پر متمکن رہے۔ فقر و فاقہ اور توکل میں زندگی بسر کی۔ ہر وقت درس دیا کرتے۔ علومِ نقلی و عقلی سے خوب آگاہ تھے۔ عمدہ تصنیفات آپ کی ہیں اور اکثر علمی کتابوں پر آپ نے شروح و حاشیے لکھے ہیں۔

تیسرے معاصر ملا عبد الباقی نہاوندی جنھوں نے آپ سے استفادہ بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

''میاں وجیہ الدین فاضلِ دانشمند و عالمِ خردمند ست۔ و شاگرد بواسطۂ عماد طارمی بود کہ از جملہ شاگردان و تلامذۂ علامہ زماں و وحیدِ دوراں مولانا جلال الدین محمد دوانی ست۔ کہ از غایت شہرت احتیاج بتعریف و توصیف ندارد۔ و

اکثری از مُلایانِ متبحر ہندوستان شاگرد میاں موی الیہ اند۔ و بجامعیتِ او درمیانِ فضلائے ایں عصر کسے بہم نمی رسد۔ و در مجاہدۂ نفس و ترکِ لذاتِ دنیاوی نیز سعی بکمال کردہ۔ تزکیۂ نفسی فی الجملہ او را بہم رسیدہ بود و احوال خیر مآل میاں مذکور از عنایت شہرت و نہایت عالمگیری از تفصیل آں باز میدارد۔ و دست در دامنِ عجز و انکسار زدن می فرماید۔ (مآثر رحیمی، حصہ سوم، ص: ۱۷ و ۱۸)

میاں وجیہ الدین ایک دانش مند فاضل اور ہوشیار عالم ہیں۔ وہ علامہ عماد طارمی کے شاگرد ہیں جو علامہ زماں اور یگانۂ زمانہ مولانا جلال الدین دوانی کے شاگردوں میں تھے۔ موصوف اپنی بے انتہا شہرت کی بنا پر کسی تعارف و توصیف کے محتاج نہیں ہیں۔ ہندوستان کے اکثر متبحر علماء میاں صاحب موصوف سے شاگردی کا تعلق رکھتے ہیں۔ اس زمانے کے فضلاء میں کوئی بھی جامعیت میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ مجاہدۂ نفس اور دنیاوی لذتوں سے کنارہ کشی میں کمال درجہ کوشش کی ہے۔ تزکیۂ نفس میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ میاں صاحب کے عمدہ احوال کی حد درجہ شہرت ان کے تفصیلی حالات کے بیان کرنے سے مجھے روکتے ہیں، اس لیے اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

آپ کے شاگرد محمد حسن غوثی منڈوی لکھتے ہیں:

''قطب سماء نشأتین، مدار حقائق کونین، مالک علوم مقبول حضوری، صاحب فنون اکتساب و وہبی، خدیو رموز قرطاسی منقوش، رازدار اسرار لوح محفوظ۔'' (گلزار ابرار فارسی قلمی، صفحہ ۲۶۷)

آپ دونوں جہاں کے قطب، دونوں عالم کے حقائق کے مرکز، حصولی اور حضوری علم کے مالک، اکتسابی اور وہبی فنون کے خداوند۔ کاغذی منقوش اشیاء کے رموز داں اور اسرار لوح محفوظ کے رازدار تھے۔

آپ کے معاصر اور جید عالم شیخ عبد القادر عیدروسی لکھتے ہیں:

و کان من اهل العلم و الزهد و حصل له القبول العظيم مع الناس و انتفع به الطلبة فی کثير من الفنون و اشتهر امره جدًا.

(النور السافر من اخبار القرن العاشر، قلمی نسخہ، صفحہ:۳۴۱)

وہ صاحب علم وزہد میں تھے۔ انھیں لوگوں میں بڑی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ طلبہ نے آپ سے بہت سے فنون میں نفع اُٹھایا اور اس کی بڑی شہرت ہے۔

مشہور مورخ معتمد خاں لکھتے ہیں:

''شیخ وجیہہ الدین از خلفائے محمد غوث اند لیکن خلیفہ کہ مرشد بخلافت او مباہات کند۔ غیر ازیں نیست و ارادت شیخ وجیہہ الدین برہانی است ساطع وحجتی است قاطع بر علوشان شیخ محمد غوث و شیخ وجیہہ الدین بفضائل صوری و معنوی آراستگی داشتہ اند۔'' (اقبال نامہ جہانگیری، جلد سوم، مخطوطہ ورق ۵۴)

شیخ وجیہہ الدین شیخ محمد غوث کے خلفاء میں ہیں لیکن ایسے خلیفہ کہ مرشد بھی ان کی خلافت پر ناز کرے سوائے ان کے کوئی نہیں ملے گا۔ شیخ وجیہہ الدین کی ارادت حضرت محمد غوث کی عظمت کی بڑی واضح اور قطعی دلیل ہے۔ شیخ وجیہہ الدین ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں سے آراستہ تھے۔

ملا محمد صادق فرماتے ہیں:

''شیخ وجیہہ الدین احمد آبادی قدس سرہ علوی ست واز علماء کبار روزگار و صاحب تقویٰ و ورع عظیم بر جادۂ شریعت استقامت تمام داشتہ۔ دائم بدرس و افادہ اشتغال می نمودہ۔'' (طبقات شاہجہانی، حصہ اول، مخطوطہ نمبر ۳۱۶)

شیخ وجیہہ الدین قدس سرہ علوی ہیں۔ اپنے زمانے کے علماءِ کبار میں ہیں۔ صاحب تقویٰ اور بڑے محتاط۔ شریعت کے راستے پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور ہمیشہ درس و افادہ میں مشغول رہتے تھے۔

بحر زخار کے مصنف اور آپ کے ہمنام شیخ وجیہہ الدین بن محمد یوسف رقمطراز ہیں:

''وبہ مشرب صوفیہ ذوقی بروجہ اتم حاصل ساخت از اکبر علمائے ملت و اعظم مقدسانِ دین وملت و بغایت سخاوت بلند و خلائق دل پسند داشت۔ بہ تربیتِ طالبان قوت مخصوص اور اعطا شدہ بود۔'' (بحر زخار، مخطوطہ، موج احوال، ۵۹۴)

صوفیہ کے مشرب کا انھیں پورا ذوق ملا تھا۔ ملت کے بہت بڑے عالم اور دین وملت کے مقدس بزرگوں میں تھے۔ سخاوت میں بلند پایہ اور خلائق میں نہایت ہر دلعزیز شخصیت رکھتے تھے۔ طلبہ کی تربیت کا خاص ملکہ قدرت نے انھیں عطا کیا تھا۔

معارج الولایت کے مصنف غلام معین الدین فرماتے ہیں:

''شیخ وجیہہ الدین علوی جامع علوم ظاہر و باطن بود و خلیفہ شیخ محمد غوث ست۔ و مرید جائی دیگر، معمر و مسن بود۔ در شب بریاضت و مجاہدہ کوشیدی و بروز بدرس و تدریس طالباں مشغول شدی و توطن در احمد آباد داشت۔''

(معارج الولایت مخطوطہ، جلد دوم، صفحہ:۵۸۲)

شیخ وجیہہ الدین علوی علوم ظاہر و باطن کے جامع تھے۔ اور شیخ محمد غوث کے خلیفہ تھے۔ مرید تو کسی اور کے تھے۔ نہایت سن رسیدہ بزرگ تھے۔ رات میں ریاضت و مجاہدہ کرتے اور دن کو طالب علموں کے پڑھانے میں مشغول رہتے۔

مشکوٰۃ النبوت کے مصنف علی محمد موسوی رقمطراز ہیں:

''بسیار اعیان از اہل کمال در علوم ظاہری و باطنی ازاں جناب فیض حاصل نمودہ بانتہائے کمال رسیدہ اند۔ آں ذات بابرکات تا دمِ حیات قدم توکل از جادۂ تقویٰ بیروں نکشیدہ۔'' (مشکوٰۃ النبوت مخطوطہ بست و سیوم)

بہت سے اہلِ کمال علوم ظاہری و باطنی میں آپ کی بارگاہ سے فیض پا کر انتہائی کمال کے درجے پر پہنچے۔ آپ کی ذاتِ بابرکات زندگی بھر توکل کا قدم جادۂ تقویٰ سے باہر نہ رکھا۔

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی فرماتے ہیں:

"صاحب المناقب الفاخرة و وجيهًا في الدنيا و الآخرة عالمًا بعلوم الجهتين و خازنًا لكنوز النشأتين...... و متع الطلبة بجلائل الافادات و ملاء شرق العالم و غربه من لوامع البركات."

(سبحة المرجان في آثار هندوستان، صفحه: ۴۵)

قابل فخر کارناموں کے مالک، دنیا و آخرت میں ذی رتبہ، ظاہری علوم و باطنی علوم سے

آگاہ اور دونوں جہاں کی زندگیوں کے خزانہ دار ...... طلبہ ان کے افاداتِ عالیہ سے مستفید ہوئے اور مشرق ومغرب کو اپنے انوار و برکات سے معمور کردیا۔

مولانا سیّد عبدالحئیؒ حسنی لکھتے ہیں:

''بڑے صاحب صدق واخلاص اور قانع تھے۔ تھوڑی سی شئے پر صبر کرتے۔ شرافت طینت میں تھی۔ لباس میں کسی فرد بشر سے امتیاز مدنظر نہ تھا۔ جو کچھ حاصل ہوتا طلبہ پر صرف کردیتے۔ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے مگر تدریس ورغبت الی اللہ اور اسباب دنیوی سے تجرد میں کمی نہ آتی۔ نہ امراء و اغنیاء کے دروازوں پر جاتے اِلاّ شاذ، وہ بھی مجبوراً یعنی کسی کی سفارش کے لیے۔ اپنے دولت کدے اور مسجد میں عبادت اور طلبہ کو افادہ کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ تصانیف میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ترتیب عبارات وتقسیم ابواب وفصول میں نہایت شستگی ہوتی تھی۔'' (نزھۃ الخواطر وبھجۃ المسامع والنواظر، الجزء الرابع)

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن کے مقالہ نگار ٹی ڈبلیو آرنلڈ (T.W. Arnold) لکھتے ہیں:

''شاہ وجیہہ الدین گجراتی شیخ محمد غوث کے مریدین میں ہیں۔ یہ علامۂ دہر تھے۔ ان کی بہت سی تصانیف ہیں[1]۔''

[1]: James Hasting etc. : Encyclopaedia of Religion and Ethics, Vol. XI, New York, 1954, P. 69 ("Saints and Martyres" by T.W. Arnold)

سلاطین وامراء کی عقیدت

حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کا خاندان اپنے علم وفضل اور دینی وجاہت کے اعتبار سے ہر دور میں ممتاز رہا۔ اس لیے گجرات کے سلاطین وامراء اور اس خاندان کے بزرگوں کے عقیدت مند رہے۔ سلطان محمود بیگڑہ نے آپ کے والد کو چانپانیر کا قاضی بنایا اور اس کے لڑکے سلطان مظفر حلیم نے محض فرطِ عقیدت کے باعث چانپانیر سے ساتھ لاکر اپنے شاہی محل کے پاس ہی قیام کرنے کو جگہ عنایت کی۔ اس کی وفات کے وقت آپ کی عمر بائیس سال کی تھی اور طلب علم میں مصروف تھے۔ بہادر شاہ گجراتی نے بھی بارہا دعائے خیر کی التجا کی۔

سلطان محمود ثالث متعدد بار حاضرِ خدمت ہوکر شرفِ قدم بوسی حاصل کرچکا تھا۔ اس کے حسنِ عقیدت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ شاہ صاحب نے چند مظلومہ کی فریادرسی کی بابت ایک خط سلطان محمود ثالث کو لکھا۔ اس نے تعمیلِ ارشاد کے بعد حکم دیا کہ ''اس خط کو محفوظ رکھو اور بوقتِ تدفین میرے سینے پر رکھا جائے، شاید یہی نجات کا باعث ہو۔''

سلطان مظفر سوم جو گجرات کا آخری بادشاہ ہے متعدد بار حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا بلکہ بعض لوگوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ تخت نشینی کے وقت اس کی کمر میں تلوار آپ ہی نے باندھی تھی۔

شہنشاہ جلال الدین اکبر جب گجرات آیا تو باوجود اس کے کہ حاسدوں نے آپ کی طرف

سے بادشاہ کو بدظن کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا، پھر بھی آپ سے ملنے کے بعد آپ کا بے حد احترام کیا اور خصوصاً چند مذہبی سوالات کرنے پر شافی جواب اس کو دیا گیا۔ اس سے تو بہت ہی خوش ہوا۔

اکبر کے بعد نور الدین جہانگیر تخت نشیں ہوا اور بغرضِ تفریح احمد آباد آیا تو خصوصیت سے شاہ وجیہہ الدین کی درگاہ پر بغرضِ فاتحہ خوانی حاضری دی، اور آپ کے خاندان کے لوگوں کو جاگیر و اوقاف سے نوازا۔

امرائے دولت بھی ہمیشہ آپ کے عقیدت مند رہے۔ الغ خاں جو آخری تاجدار گجرات سلطان مظفر سوم کے امراء میں سے تھا، آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ چنگیز خاں کی ماں بھی آپ کی ارادت مند تھی۔ اکثر اوقات بیش قیمت چیزیں آپ کے یہاں امانت رکھوا دیتی تھی اور وہ برسوں آپ کے پاس پڑی رہتی تھیں۔ اسی طرح شیر خاں بن اعتماد خاں گجراتی وزیر سلطان مظفر سوم کا بھی آپ پر بڑا اعتماد تھا اور بارہا اس نے بھی بیش قیمت امانت آپ کے پاس رکھوائی[1]۔

عہدِ اکبری میں خان اعظم اور مرزا عبد الرحیم خانخاناں جو یکے بعد دیگرے صوبہ دار مقرر ہوئے وہ نہایت عقیدت مندی کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حسنِ سلوک کرتے تھے۔ خانخاناں کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے دورانِ قیامِ احمد آباد میں آپ سے بعض کتبِ درسیہ بھی پڑھیں اور آپ سے ترقیِ مراتبِ عالیہ کے لیے استدعا کی۔ چنانچہ آپ اس کے لیے دعا گو رہے۔ عبد الباقی نہاوندی نے 'مآثر رحیمی' کے نام سے عبد الرحیم خانخاناں کی مبسوط سوانح عمری لکھی ہے۔ اس نے خانخاناں کی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"یہ سپہ سالار اکثر اوقات کسبِ کمال اور حصولِ فضل و آداب کے اس بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اپنی ذہانت و فطانت کے باوجود اس دانشمند کی صحبت میں مطالعہ و علمی مباحث سے دلچسپی لے کر خدا شناسی کا رتبہ پایا۔ اس بزرگ کے اوصاف و کمال سے حد درجہ عقیدت ہی کی بنا پر محتاج و فقراء اور ضرورت مند حضرات میاں صاحب موصوف کو اس کے دربار میں وسیلہ بناتے

۱؎ ظفر الوالہ، جلد دوم۔

اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر اس کے خوانِ کرم سے فیضیاب ہوتے۔ اور خود بھی باوجود تکلف و بزرگانہ تواضع کے اس کی بخشش و فیاضی سے خصوصیت کے ساتھ نوازے جاتے۔ آپ ہمیشہ اس کے انعام و اکرام کا عمدہ طور سے تذکرہ کرتے۔ اس کے لیے مخلصانہ دعا فرماتے اور آپ کی دعائیں اس کے حق میں ملاءِ اعلیٰ تک پہنچتیں۔ جس طرح شاگرد اپنے استاد کے ساتھ اور مرید اپنے پیر کے ساتھ سلوک کا اظہار کرتا ہے اسی طرح یہ قدردان بھی باوجود حشمت و جاہ ان کے ساتھ اسی طرح پیش آتا۔ اور اگر کبھی اس کی پیش کش آپ قبول فرما لیتے تو اپنے اوپر اسے احسان سمجھتا۔ جب تک دنیا قائم ہے اس مقدس گروہ کی دعائیں اس کے حق میں اسی طرح سازگار رہیں گی[1]۔"

امرائے اکبری میں صادق محمد خاں ہروی پنج ہزاری منصب پر فائز تھا۔ خانخاناں اور مرزا شاہرخ کو جب بادشاہ نے اپنے حضور طلب کر لیا تو سپہ سالاری اور ملک کا انتظام بلا شرکتِ غیرے صادق محمد خاں کے سپرد ہوا۔ صادق محمد خاں بھی شاہ وجیہہ الدین کا نہایت عقیدت مند تھا اور برابر آپ کی صحبت میں بیٹھ کر فیض حاصل کرتا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے مقبرے کی عمارت اسی نے بنوائی۔

نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید اکبر کے عہد میں بخشی کے عہدے پر مامور تھے۔ شہنشاہ جہانگیر کا دور آیا تو اپنی دیانت، راست بازی اور حسن کارکردگی کی بدولت گجرات کے والی بنائے گئے۔ شیخ فرید نے دلّی کے قریب فرید آباد اور احمد آباد کے اندر محلہ بخارا آباد کیا۔ شیخ فرید کو علماء و مشائخ سے گہری عقیدت تھی۔ خواجہ باقی باللہ اور حضرت مجدد الف ثانی کے خطوط ان کے نام ان کی مذہبی قدر و منزلت کو ظاہر کرتے ہیں۔ شیخ فرید کو شاہ وجیہہ الدین سے بھی بڑی عقیدت تھی اور اپنی اسی عقیدت کی بنا پر آپ کے مقبرے کی اوپر کی چھتری شیخ فرید ہی نے تیار کرائی جس پر سیپ کا نہایت اعلیٰ درجہ کا کام ہوا ہے۔

۱؎ مآثر رحیمی، حصہ سوم، صفحہ: ۱۷ و ۱۸۔

وفات

حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی ۲۹/صفر ۹۹۸ھ مطابق ۲۸/دسمبر ۱۵۸۹ء بروز یکشنبہ صبح صادق کے وقت اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۸ برس کی تھی۔ وفات کی تاریخ "لھم جنات الفردوس نزلا" ایک شخص نے تحریر کی ہے۔ جس سے ۹۹۸ھ کی تاریخ نکلتی ہے۔ اس تاریخ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی تاریخ تھوڑے سے تغیر سے شاہ صاحب کے والد کی وفات کی بھی ہے یعنی 'لہ' اور 'لھم' کے فرق سے دونوں کی الگ الگ تاریخیں نکلتی ہیں[1]۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ تاریخ آپ کے تلمیذِ رشید مولانا عبدالعزیز نے تحریر کی ہے، جو ان کی ذہانت اور فطانت کی شہادت ہے۔ چنانچہ آپ کی رحلت کی تاریخ ''شیخ وجیہہ دین'' نکالی ہے۔ پھر ''شیخ'' سے سالِ ولادت اور ''وجیہہ'' سے مدتِ تکمیلِ علوم وفنون اور ''شیخ وجیہہ'' سے آغازِ تعلیم و تعلّم اور لفظ ''دین'' سے کل مدتِ تدریس و ہدایت اور ''وجیہہ دین'' سے کل مدتِ عمر نکلتی ہے[2]۔

اس کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی مختلف تاریخیں لکھی ہیں۔ مثلاً علوی صاحب جمال بہشت۔ بہ بہشت مسکن وجیہہ الدین، آخر الاولیاء وجیہہ الدین وغیرہ وغیرہ۔ وفات کے بعد

[1] رسالہ حسن فرائی قلمی مملوکہ کتب خانہ پیر محمد شاہ، احمد آباد۔
[2] خلاصۃ التوحید قلمی، ص:۲۔

لوگوں نے ان کے بہت سے مرثیے کہے جو عربی، فارسی، اُردو زبان میں موجود ہیں۔ مولانا ابراہیم دکنی کا عربیہ مرثیہ بہت پُردرد اور پُراثر ہے۔ اس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

الی احمدآباد احنّ تشوقًا
بحبّ الّذی اھواہ ، قلبی تفاخرًا
فذاک وجیہ الدین ذو الجاہ لا یریٰ
عراۃُ لطلّاب الھدایۃ مقصدًا
و ھاد الی نحو الرشاد مرشدٌ

منقبت کے اشعار:

ملا عبدالنبی احمدنگری نے اپنی کتاب 'جامع الغموض منبع الفیوض المعروف بہ شرح کافیہ فارسی' کے آخر میں ایک طویل نظم لکھی ہے جس میں حضرت شاہ وجیہہ الدین کی شان میں لکھتے ہیں:

جامع علم و کامل عرفاں　　والی ملک و فضل شاہ جہاں
طالباں را بحق رسانیدہ یقیں　　عاشقاں را نمودہ روئے مبیں
صوفی و صافی از کدورت خاک　　سر بسر جان از عناصر پاک
خوش بگو نام او وجیہہ الدین　　وجہ او وجہ پاک دین متیں
قدّس اللّٰہ سرّہٗ الاعلیٰ　　نوّر اللّٰہ وجھہ بصفا

اُردو کے قدیم شاعر ولی دکنی جنھیں گجراتی بھی کہا جاتا ہے، بعض محققین نے ان کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی تک پہنچایا ہے۔ شاہ صاحب کی مدح میں بڑا طویل ترجیع بند لکھا ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے عقیدت اور تعلقِ خاص کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

اے تو مقبولِ سرورِ عالم　　اے تو فہرستِ دفترِ عالم
جلوہ گر تو ہے آفتاب یقیں　　تجھ سوں روشن ہے پیکرِ عالم
علم ظاہر و علم باطن سوں　　تو ہے عالم میں رہبرِ عالم

[1] رشاد شرح ارشاد آپ کی تصنیف ہے۔ بطور تلمیح اس کا ذکر ہے۔

دل عرفاں سرشت ہے تیرا — مظہرِ خلق و منظرِ عالم
نام تیرا ہے وردِ صاحب درد — ذات تیری ہے مفخرِ عالم
دست گیری تری ہووے ظاہر — جبکہ برپا ہو محشرِ عالم
ہے ترے نام پر سدا قرباں — روز و شب سال و مہ سرِ عالم
تجھ اُپر جیوں سرج ہویدا ہے — مطلب جملہ مضمرِ عالم
اس زمانے میں حق نے تجکوں کیا — مہترِ خلق و بہترِ عالم

اے امامِ جمیع اہلِ یقین
قبلۂ راستاں وجیہہ الدین

اے تو ہے آفتابِ عالم تاب — فیض تیرے سوں جگ ہے مقصدیاب
دل ترا کانِ علم و بحرِ عمل — ہر معانی ہے اس میں دُرِ خوش آب
روئے انور کی تیرے دیکھ ضیاء — رشک سوں آفتاب ہے بیتاب
متفق ہو کے عاقلاں نے کہا — دل کو تیرے جگت میں لبِ لباب
فکر تیری ہے آبِ دانش و ہوش — ہر گلِ عقل تجھ سوں ہے سیراب
مکھ سوں تیرے بچن مبارک سن — گل کے گوہر ہوا سراپا آب
اے تو مجموعۂ فراستِ تام — دل ترا مطلب ہزار کتاب
تا قیامت گریز پا نہ اچھے — تجھ محبت کی آگ سوں سیماب
مانگتے ہیں مدد سوں تجھ شہہ کی — روز و شب چند رستم و داراب
اس زمانے میں بے گماں بے شک — تجھ میں ہے سب طریقۂ اصحاب

اے امامِ جمیع اہلِ یقین
قبلۂ راستاں وجیہہ الدین

فیض تیرا ہے ابرِ نیسانی — دو جہاں پر کیا دُر افشانی
دل ترا مظہرِ تجلّیِ حق — مکھ ترا رونقِ مسلمانی

سجدہ کرنے کو روز آتا ہے — چاند سر تا قدم ہو پیشانی
تیری درگہ کی خاک دیکھ گیا — روئے آبِ حیات سوں پانی
ہر سحر آفتاب کرتا ہے — تیرے روضے اُپر زر افشانی
عالماں دیکھ تجھ فصاحت کوں — سٹ دیئے دعوئ سخن دانی
تجھ دلِ صاف سوں ہوئی ظاہر — آئینے میں تمام حیرانی
ہے ولایت کے تخت پر تجکوں — شوکت و حشمتِ سلیمانی
زندگی بخش ہے خیال ترا — یاد تیری ہے آبِ حیوانی
جن نے دیکھا ہے پاک مرقد کوں — ان نے پایا ہے قربِ حقانی

اے امامِ جمیع اہلِ یقیں
قبلۂ راستاں وجیہہ الدین

اے شہِ بحر و بر ہے تجھ سر پر — آسماں چتر و آفتاب افسر
تو ہے مقبولِ حق کی درگہ کا — روح تیری کوں عرش پر ہے گذر
کاں فلک کے ملائکہ دیکھیں — تجھ سری کا دو جامۂ انور
آسماں سوں اُتر کے آتے ہیں — تیری مجلس میں نُقل ہوا اختر
ہے سزاوار انجمن میں تری — زہرہ آوے اگر ہو خنیاگر
وہ ہے روضہ زمیں اُپر تیرا — شش جہت جس کوں دیکھ ہے ششدر
کیا کہوں گنبد شریف کوں میں — اوج میں ہے فلک سوں وہ ہمسر
تجھ سوں خورشید کوں وہ پایا ہے — کیوں نہ ہووے فلک سوں بالاتر
تجھ سوں سب خادماں کوں نت ہے شرف — اے مبارک نہاد پاک گہر
دو جہاں میں مرا ہے مقصد یہ — کہ کرو مجھ پہ یک کرم کی نظر

اے امامِ جمیع اہلِ یقیں
قبلۂ راستاں وجیہہ الدین

اے گلِ گلشنِ حسینؓ و حسنؓ — تجھ سے روشن ہوا زمین و زمن

عالمِ فرش سو لے جا بر عرش — حق نے جنت کیا ترا مسکن

فیض تیرا عیاں ہو جس ساعت — بحر کا پُر گہر کرے دامن

گوہرِ فکر تجھ سوں ہے سیراب — جوہرِ عقل تجھ سوں ہے روشن

خلق یوں بہرہ تجھ سوں پاتی ہے — فیض جیوں آفتاب سوں معدن

آسماں کے اُپر گداز ہے نت — شوق تیرے سوں ماہ سیمیں تن

عشق تیرے کی آگ میں خورشید — سرسوں لے پگ تلک ہوا ہے اگن

دیکھنے کوں ترے ہوا مشتاق — گل نرگس سوں کھول چشم چمن

یوں تو ہے انتخاب عالم میں — جیوں کہ ہے آدمی میں نطقِ سخن

خوش بصارت بدل کیا ہے ولؔی — گرد تیرے قدم کی کحل نین

اے امامِ جمیعِ اہلِ یقیں

قبلۂ راستاں وجیہہ الدین

(کلیاتِ ولؔی)

تعمیرِ مزار:

حضرت شاہ وجیہہ الدین کا مزار مدرسۂ علویہ کے صحن میں بنایا گیا۔ امرائے اکبری میں سے صادق خاں نے روضے کی عمارت تیار کرائی اور امرائے جہانگیری میں سے فرید خاں المخاطب مرتضٰی خاں بخاری نے اپنے عہدِ صوبہ داریٔ گجرات میں مرقد کے اوپر چھتری تیار کروائی جس پر سیپ کا کام نہایت اعلیٰ درجے کا ہے اور اس کے اوپر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں۔

مرتضٰی خاں فرید دریا دل

فیضِ وافی و رحمتِ شامل

عرش بر طرح کرد از ہمت

بر سرِ قبرِ مرشدِ کامل

محو دیدارِ حق وجیہہ الدیں

آن بموت و حیات خود واصل

در بر شاہدِ ازل خفتہ

از شرابِ وصال لا یعقل

ہست عین حضور آگاہی

غفلت او را نمی کند غافل

کعبۂ از درون چناں روشن

کہ جدارش نمی شود حائل

قبلۂ حاجت و مقام بر او

مبداء فیض عارف و کامل

سالِ تاریخ او ز غیب رسید

عرشِ اسلام و قبلۂ مقبل

تا فلک باد ، باد بانیٔ ایں

تا جہاں باد ، باد ایں منزل

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۱۷ھ میں یہ مرزا تعمیر ہوا۔ آج بھی یہ مزارِ پُر انوار زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کی مزار پر حاضری:

شہنشاہ جلال الدین اکبر کی وفات کے بعد جب نور الدین جہانگیر تخت نشیں ہوا اور بغرضِ تفریح احمد آباد[۱] آیا تو خصوصیت سے تین جگہ بغرضِ فاتحہ خوانی گیا۔ حضرت شاہ عالمؒ کے مقبرہ پر، سرکھیج شیخ احمد کھٹوؒ کے مزار پر اور حضرت شاہ وجیہہ الدین کی درگاہ پر۔ چنانچہ احمد آباد کے سفر پر اس نے خود اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ لکھتا ہے:

۱؎ شہنشاہ جہانگیر ۱۰۲۶ھ میں احمد آباد آیا۔

''اتوار ۲۷ دی ماہ کو میں نے شیخ وجیہہ الدین کے مقبرے پر جو میری قیام گاہ کے قریب ہے، جا کر فاتحہ خوانی کی۔ یہ خانقاہ میرے والد بزرگوار کے امراء میں سے صادق خاں نے تعمیر کرائی تھی۔ شیخ وجیہہ الدین شیخ محمد غوث کے خلیفہ تھے جن پر خود ان کے مرشد کو فخر تھا۔ شیخ وجیہہ الدین ظاہری و باطنی صفات سے بہرہ ور تھے۔

تیس سال ہوئے کہ وہ اسی شہر میں وفات پا گئے۔ بعد ازاں اُن کے بیٹے شیخ عبداللہ جو بہت بڑے عبادت گذار صوفی تھے، اپنے والد کی وصیت کے مطابق ان کی مسند پر بیٹھے۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے فرزند شیخ اسداللہ اُن کے جانشین مقرر ہوئے۔ اُن کا بھی جب انتقال ہو گیا تو ان کے بھائی شیخ حیدر صاحب سجادہ نشین مقرر ہوئے جو ہنوز بقیدِ حیات ہیں اور اپنے آباء و اجداد کے مزاروں اور درویشوں اور صوفیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔ ان دنوں شیخ وجیہہ الدین کا عرس شروع ہونے والا ہے، اس لیے میں نے اخراجات کے لیے ڈیڑھ ہزار روپے شیخ حیدر صاحب کو عنایت کیے اور پانچ سو روپے شیخ وجیہہ الدین کے بھائی کو عنایت کیے۔

اسی طرح شیخ وجیہہ الدین کے عزیز و اقرباء کو بھی ان کی حیثیت کے مطابق روپے اور زمینیں عنایت کیں اور شیخ حیدر سے فرمایا کہ جن درویشوں اور ضرورت مندوں کے حالات سے وہ واقف ہیں انھیں میری خدمت میں روانہ کریں تا کہ میں ان کو مدد خرچ اور زمینیں عنایت کروں۔''

(تزک جہانگیری۔ اُردو ترجمہ سیّد احمد علی رامپوری، ص: ۷۷)

جاگیریں اور اوقاف:

جہانگیر نے آپ کے خاندان اور مدرسۂ علویہ کے لیے جاگیریں عنایت کیں۔ موضع بسوورہ اور موضع باریجری اولاد کے معاش کے لیے دیے اور موضع دستزال، موضع دستالی اور موضع ہرنا مدرسہ و خانقاہ اور روضہ کے اخراجات کے واسطے بطور وقف ہدیہ کیا۔ یہ مدرسہ اسی وقف سے

ہمیشہ چلتا رہا اور اس منبع فیض سے ہزاروں تشنگانِ علم برسوں سیراب ہوتے رہے۔ مدرسہ کب بند ہوا اس کے متعلق کوئی صحیح تاریخ نہیں بتائی جا سکتی۔ اس سلسلے میں مولانا ابوظفر ندوی نے اپنے مقالہ[1] میں لکھا ہے کہ:

''اتفاقاً چند دن ہوئے کہ دو دستاویزیں میری نظر سے گذریں۔ ان میں سے ایک کے محرر جناب سیّد فیض اللہ بن سیّد اسداللہ بن سیّد رحمت اللہ بن سیّد حسین بن سیّد عبدالعلی بن سیّد اسداللہ بن سیّد شاہ عبداللہ بن حضرت شاہ وجیہہ الدین ہیں۔ سیّد فیض اللہ صاحب نے اس دستاویز کے ذریعے اپنی تمام جائداد اور عہدہ وغیرہ کا متولی اپنے لڑکے سیّد محمد شجاع الدین صاحب کو بنایا ہے۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:

''تولیت نامہ بمہر مغفرت حسن محمد خاں معروف بہ علی محمد خاں مرحوم دیوان صوبہ سابق و بہ مہر غلام حسین خاں صدر مغفور۔''

اور آخر میں تاریخ ۱۶ر شوال ۱۱۸۵ھ ہے۔ اور اس عہد کے مفتی سیّد بدرالدین کی جو مہر ہے، اس پر ۱۱۹۵ھ کندہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل تحریر تو ۱۱۸۵ھ کی ہے اور اس کی نقل مفتی موصوف کے عہد ۱۱۹۵ھ میں اس وقت لی گئی جب سیّد فیض اللہ صاحب متوفی ۱۱۸۹ھ کے بعد کسی تنازعہ کے سبب ضرورت پڑی ہوگی اور اسی سبب سے غالباً 'دیوان صوبہ علی محمد خاں اور غلام حسین خاں صدر' کو مرحوم و مغفور لکھا ہے۔ کیونکہ مفتی صاحب کے عہد سے پہلے یہ وفات پا چکے ہوں گے۔ میرا اگر یہ قیاس صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ علی محمد خاں ۱۱۸۵ھ میں بقیدِ حیات تھے اور گو سرکاری اعتبار سے وہ دیوان نہ تھے مگر لوگوں میں سابق دیوان کہلاتے تھے۔ اور کاروبار میں ابھی تک لوگ اُن کی مہر اور دستخط سے کام نکالتے تھے۔ مرآۃ احمدی کے مصنف کا نام بھی علی محمد خاں محمد حسن ہے۔ اُن کی مہر پر ۱۱۶۴ھ کندہ ہے۔ وہ اسی عہد میں احمد آباد کے دیوان

[1] رسالہ معارف، اعظم گڑھ، ماہ فروری ۱۹۳۳ء۔

تھے۔ اپنی تاریخ گجرات میں ۱۱۷۴ھ کے حالات درج کیے ہیں اور اسی کتاب کے خاتمے سے ۱۱۷۶ھ تک ان کا زندہ رہنا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر اُن کی زندگی کا کوئی ثبوت دستیاب نہیں ہوا۔ اس لیے قیاس یہ کرلیا گیا کہ شاید ۱۱۷۶ھ یا ۱۱۷۷ھ میں وفات پاگئے۔ یہ تولیت نامہ اُن کا آخری تحریر کردہ ۱۱۷۶ھ کے نو برس بعد کا ہے۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ انہی کے عہد کا تحریر کردہ ہو۔ اور وہ اس وقت تک بقیدِ حیات تھے۔ مرآۃ احمدی میں ان کا نام ''محمد حسن'' اور اس تولیت نامہ میں ''حسن محمد خاں'' ہے۔

اس محمد کے تقدم و تاخر کے متعلق میرا خیال ہے کہ یا تو کاتب کی جلدنویسی کا نتیجہ ہے یا ممکن ہو کہ مصنف ہی کے دونوں نام ہوں، کیونکہ یہ بالتحقیق معلوم ہے کہ اس عہد میں اور کوئی دوسرا دیوان مقرر نہیں ہوا تھا، کیونکہ ۱۱۷۱ھ میں صوبہ دار مومن خاں کے چلے جانے کے بعد مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا۔ افسوس ہے کہ نقل لیتے وقت اصل میں سے تمام مہروں اور دستخطوں کی نقل چھوڑ دی۔ اگر ان کی بھی نقل ہوتی تو بڑی آسانی سے اس کا فیصلہ ہوسکتا تھا۔ اس تولیت نامہ میں جاگیر کے ضمن میں موضع بہرتنکہ (علاقہ منگلور) اور نصف گاؤں دنتالی (دہ کروئی) مذکور ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ۱۵۹ برس میں تمام جائداد سے صرف اسی قدر باقی رہ گئے۔ سیّد فیض اللہ صاحب علوی کا انتقال ۱۱۸۹ھ میں ہوا۔

دوسرا کاغذ بھی تولیت نامہ ہے۔ محرر کا نام سیّد شجاع الدین بن سیّد فیض اللہ ہے۔ سیّد شجاع الدین صاحب کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ ایک لڑکی مسماۃ بوبو تھی۔ اس کا لڑکا یعنی شجاع الدین کا نواسہ کے حوالہ کردیا ہے۔ اس تولیت نامہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے: ''تولیت نامہ بمہر این خادم شرع شریف و بمہر امارت و وزارت مرتبت شفیع محمد خاں المخاطب بہ علی محمد خاں دیوان صوبہ و بمہر میر فیاض الدین صدر۔''

خادمِ شرع شریف قاضی شیخ الاسلام خاں کی مہر پر ۱۲۱۰ھ کندہ ہے اور آخر تحریر میں تاریخ ۱۱ر رمضان ۱۲۱۹ھ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس تولیت نامہ کے لکھتے ہی وقت اس کی نقل اصل سے لے لی گئی تھی۔ اس پر تمام علماء، صوفیہ، قاضی، صدر الصدور، دیوان صوبہ کی مہروں اور دستخطوں کی نقل موجود ہے۔ خود سیّد شجاع الدین علوی کی مہر میں ہے کہ ''از وجیہ الحق مدد خواہد شجاع''۔ جاگیر کے متعلق صرف موضع بہرتنکہ کا ذکر ہے۔ سیّد شجاع الدین صاحب اپنے والد سیّد فیض اللہ صاحب کے بعد سے اس تحریر کے وقت تک تیس برس متولی رہے۔ اس قلیل مدت میں موضع دنتالی کا نصف حصہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بہر حال ان دونوں تحریروں کے پیش کرنے کا اصل منشا یہ ہے کہ ہر دو تحریر میں مسجد، مدرسہ، خانقاہ کا ذکر ہے اور انہی کی تولیت ان کے سپرد کی گئی تھی۔ گو کہ یہ تحریر ۱۲۱۹ھ کی ہے لیکن سیّد شجاع صاحب کی وفات ۱۲۳۶ھ میں ہوئی ہے۔ اس لیے یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ مدرسہ ۱۲۳۶ھ تک قائم تھا۔ اور غالباً سیّد شجاع الدین صاحب آخری عالم ہیں جن سے مدرسہ کو رونق رہی۔''

کتب خانہ مدرسہ:

شاہ وجیہ الدین کا کتب خانہ گجرات کے مشہور کتب خانوں میں تھا اور تقریباً ہر فن کی کتابیں موجود تھیں۔ مولانا ابوظفر ندوی لکھتے ہیں کہ: ''۱۹۲۱ء میں اس کتب خانے کو دیکھنے گیا تو متعدد بڑے بڑے صندوقوں میں کتابیں بے ترتیبی سے پُر تھیں۔ چند دن کی پیہم کوشش کے بعد میں نے ان کتابوں کے اوراق منتشر کو مجتمع کرکے باترتیب رکھوا دیا تھا۔ لیکن اب ۱۹۳۱ء میں وہاں گیا تو کچھ کتابیں احباب کی نذر ہوئیں۔ کچھ عربی کتابوں کو مجاور نے قرآن سمجھا اور کمال دانائی سے بغرضِ ثواب ان کرم خوردہ کتابوں کو قدِ آدم زمین کھود کر دفن کردیا۔ باقی کرم خوردہ کتابیں دریائے سابرمتی کی نذر ہوئیں۔ کچھ تھوڑی سی کتابیں جناب سیّد پیر حسینی صاحب مصنف تذکرۃ الوجیہ اور جناب بڑا میاں صاحب موجودہ متولی درگاہ کے پاس ہیں[1]۔''

۱؎: معارف، فروری ۱۹۳۳ء۔

شاہ وجیہہ الدینؒ کی اولاد

حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی نے اپنے پیچھے پانچ صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔ ان میں سب سے بڑے شاہ عبداللہ علوی ہیں جو آپ کے صحیح جانشین تھے۔ ان کے فضل وکمال اور محاسن کے بارے میں تمام تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے۔ ہم خلفاءِ کبار اور ممتاز تلامذہ کے باب میں تفصیل سے لکھیں گے۔ لیکن دوسرے صاحبزادوں کے بارے میں کہیں معلومات نہیں ملتی ہیں۔ 'مجموعۂ حالات شاہ وجیہہ الدین علوی' مرتبہ محمد یوسف کھٹ کھٹے میں کچھ حصہ عربی میں دیا گیا ہے جو غالباً اسی خاندان سے قریبی تعلق رکھنے والے نے لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ ہم یہاں درج کرتے ہیں:

(۱) شاہ عبداللہ۔

سب سے بڑے فاضلِ زمانہ اور متقی و پرہیزگار، ریاضت و اشغال میں منہمک رہنے والے۔ تدریس کے ماہر اور آپ کے جانشین تھے۔ شاہ عبداللہ کے تین لڑکے تھے۔ اوّل ابوتراب جو کہ تصوف میں کامل اور بڑے زاہد وخداترس تھے۔ ان کے زہد کے متعلق یہ حکایت سنی گئی ہے کہ مشائخ نے ان کو ان کے والد کی وفات کے بعد جانشین بنانا چاہا تو اسے انھوں نے قبول نہیں کیا۔ انھوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ دوسرے شاہ اسدال تھے جو جید عالم و حافظ تھے۔ قرآن پاک سے انتہائی شغف تھا۔ ہر روز ایک ختم کرتے اور دعوت واذکار واشغال میں

درجۂ کمال انھیں حاصل تھا۔ اپنے والد کے بعد دو برس اور کئی مہینے جانشین رہے۔ ماہ جمادی الاخریٰ میں وفات پائی۔ تیسرے شاہ حیدر تھے جو تمام فنون میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ اپنے بھائی کے بعد جانشین ہوئے اور ماہ رمضان المبارک ۱۰۴۱ھ میں انتقال کیا۔ آپ کی صاحبزادی راجی صفیہ عورتوں میں نہایت ممتاز اور خدارسیدہ خاتون تھیں۔ شاہ اسداللہ کے دو فرزند تھے؛ پہلے فرزند شیخ وجیہہ الدین اور ان کے دو لڑکے اسداللہ اور غلام محمد۔ اور غلام محمد کے دو لڑکے تھے؛ عبداللہ اور شیخ وجیہہ۔ شیخ اسداللہ کے دوسرے فرزند شیخ علی تھے جو کہ اپنے چچا اور خسر کے بعد چھ مہینے تک جانشین رہ کر ربیع الثانی میں فوت ہوئے اور ایک لڑکا شیخ حسین چھوڑ گئے جو اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ جمادی الاولیٰ ۱۰۸۴ھ میں وفات پائی اور اپنے پیچھے تین لڑکے چھوڑ گئے۔ اوّل سیّد رحمت اللہ جو اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر ثابت تھے۔ دوم سیّد فضل اللہ، سوم سیّد لطف اللہ۔

(۲) شاہ عبدالواحد۔

شاہ وجیہہ الدین کے صاحبزادے شاہ عبدالواحد جو کہ اپنے بھائی کی طرح خوبیوں کے مالک تھے ۱۰۳۲ھ میں وفات پائی۔ ان کے ایک فرزند شیخ رحیم محمد نام کے تھے۔ رحیم محمد کے دو لڑکے تھے؛ شیخ نوراللہ اور شیخ عنایت اللہ۔ شیخ نوراللہ کے ایک لڑکی اور شیخ عنایت اللہ کے ایک لڑکا عبدالواحد نام تھا اور دو لڑکیاں تھیں۔ شیخ عبدالواحد ثانی کی ایک لڑکی تھی۔

(۳) شاہ عبدالحق۔

شاہ وجیہہ الدین کے تیسرے صاحبزادے شاہ عبدالحق تھے۔ شاہ عبدالحق ہمیشہ اشغال و اذکار میں سرگرم رہتے۔ ان کا انتقال ۱۰۴۰ھ میں ہوا۔ ان کے دو لڑکے تھے: ایک سیّد محمود جو اپنے والد کی حیات میں ایک لڑکا سیّد مزمل چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ دوسرے وجیہہ الدین المشہور بہ بیدہ میاں جن کے لڑکے شیخ سراج الدین تھے۔ سیّد مزمل کے دو لڑکے تھے: ایک سیّد محمود اور دوسرے سیّد یعقوب۔ سیّد محمود کے دو لڑکے تھے جن کا نام سیّد شریف محمد اور سیّد کلاں تھا اور سیّد یعقوب کے دو لڑکے تھے سیّد کبیر اور سیّد پیر۔

(۴) شاہ غالب ۔

جو بچپن سے وفات تک مجذوب رہے اور نہ ان کی شادی ہوئی۔

(۵) شاہ حامد ۔

پانچویں صاحبزادے شاہ حامد تھے جو کہ جید عالم و حافظ اور کتابوں کے نہایت شائق تھے۔ ان کی خرید و فروخت میں لگے رہتے۔ کتابوں کو لکھواتے۔ ان پر حاشیے چڑھاتے اور پھر ان کی تصحیح کرتے تھے۔ شاہ حامد کے ایک لڑکے تھے حبیب اللہ جو کہ احمد آباد سے برہانپور چلے گئے۔

شاہ وجیہہ الدین کے ایک فرزند اور تھے شاہ محمد جو برہانپور چلے گئے اور حیاتِ والدین میں فوت ہوگئے تھے۔ ان کی اولاد میں کچھ لوگ احمد آباد میں، کچھ برہانپور میں اور کچھ بیجاپور میں ہیں۔

خلفائے کبار اور ممتاز تلامذہ

شاہ عبداللہ علوی احمد آبادی

حضرت شاہ وجیہہ الدین علویؒ کے پانچ صاحبزادے تھے لیکن ان میں شاہ عبداللہ جامعِ کمالات تھے۔ درسی علوم میں مہارت کے ساتھ تصرف کے اسرار و حقائق میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ سیرت وشمائل، تقویٰ و بزرگی میں اپنے پدر بزرگوار کے قدم بہ قدم تھے۔ حضرت شاہ وجیہہ الدین کی وفات کے بعد آپ کے مسند نشیں ہوئے۔ آپ کے زمانے میں بھی تشنگانِ علوم اور طالبانِ معرفت کا وہی ہجوم برقرار رہا جو آپ کے والد ماجد کے دور میں تھا۔ مدرسہ علویہ میں تقریباً بیس سال تک درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا۔ آپ کی گوناں خصوصیات کا تذکرہ آپ کے معاصر محمد حسن غوثی نے 'گلزارِ ابرار' میں نہایت احترام وعقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ غوثی لکھتے ہیں:

> ''آپ کی ذات میں تمام عقلی ونقلی علوم جمع تھے۔ کسبی اور کشفی دقیقے اور مشکل مسائل آپ کی ادنیٰ توجہ سے حل ہوجایا کرتے تھے۔ عالم شہادت اور عالم غیب کے حقائق کا جلوہ آپ کے اوپر ہوتا تھا۔ عالم صوری اور عالم معنوی کی معرفت حاصل تھی۔ نیز اپنے پدر بزرگوار کے ظاہری کمالات اور باطنی خزانوں کے وارث تھے۔ کم وبیش دو قرن آپ کے والد کا زمانہ ہے، اس مدت میں ایک گھڑی بھی خدمت اور حضور سے جدا نہیں ہوئے۔ ہمیشہ باپ کی کام بخش

دانش و بینش سے فائدہ اُٹھایا۔ اور ہر دو جہاں کی فلاح اور معرفت حاصل کی۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت وجیہہ السلت کی موت کا وقت نزدیک آ پہنچا تو انھوں نے خرقۂ خلافت اور فرمانِ اجازت آپ کو عنایت فرما کر ظاہری اور معنوی طور سے اپنا جانشین بنایا۔ مسندِ ارشاد و ہدایت پر متمکن ہوتے ہی ریاضت و عبادت میں انہماک بڑھ گیا۔ روزانہ کی خوراک صرف شربت کا پیالہ اور مصری کی ایک ڈلی کفایت کرتی تھی۔ ان دونوں بزرگوں میں عجب یکتائی اور یکسانیت تھی۔ باہر سے آنے والا مسافر ہو یا مقامی شخص؛ کوئی یہ معلوم نہیں کرسکتا تھا کہ مقام کسی دوسرے جانشین کے سپرد ہوگیا ہے۔ وہی طور وطریقہ اور اگلی روش بدستور باقی تھی۔

ایک شخص تاش بیگ نام۔ سعادت مند دو جہانی نواب کامیاب اعظم خاں کے پرانے ملازموں میں سے ہے۔ اور وہ آپ کی خدمت کی برکت سے سرداری کے درجے کو پہنچ گیا اور پھر شاہی منصب داروں میں داخل ہوگیا۔ اس کا بیان ہے کہ جس سال نواب اعظم خاں نے اطراف سورت کی فتح کے واسطے لشکرکشی کی تو وہاں پر ایک بہت بڑی جنگ ہوئی۔ حریف لشکر کے مقابلے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ طبیعت سخت گھبرائی تو صدق نیت کے ساتھ حضرت شاہ عبداللہ کو یاد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہنگامہ فرو ہونے کے وقت تک آپ کی صورت (مثالی صورت) کو میں اپنے گرداگرد دیکھتا رہا۔ آپ کی دعا اور برکت سے میدانِ جنگ سے فاتح وکامراں ہوکر نکل آیا اور حریف کو شکست ہوئی۔''

غوثی اس سلسلے میں ایک روایت اور بیان کرتے ہیں کہ صادق محمد خاں کا ایک عمل دار تھا۔ وہ خیانت کی تہمت میں ماخوذ ہوا اور قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ اس کے ایک بھائی تھا جو ہمیشہ شیخ عبداللہ کی خدمت میں آتا جاتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی رہائی کے دعا کی التماس کیا کرتا تھا۔ چونکہ تمام کاموں کا ہونا اپنے وقت پر منحصر ہے، اس واسطے آپ نے دعا نہیں کی۔ اسی طرح ایک مدت

گزر گئی۔ ایک روز بے موسم کا ایک سیب شیخ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سیب شیخ نے قیدی کے بھائیوں کو دیا اور فرمایا مایوس قیدی کے پاس پہنچا دو۔ ہنوز اس میوہ کی خوشبو قیدی کے دماغ میں پہنچی نہ تھی کہ صادق محمد خاں نے کمال نرمی اور مہربانی سے اس کو یاد فرمایا اور کہا یہ بے چارہ یوں ہی ناحق قید خانے میں پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ اسی وقت بیڑیاں پاؤں سے کاٹ کر حاضر کیا گیا اور ایک عمدہ خدمت اس کو دی گئی۔ مصرع: آفتابِ معرفت یک لحۂ رخسارِ اوست

سیّد ہاشم حسنی العلوی متوفی ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء شاہ عبداللہ کے چچازاد بھائی تھے جو بیجاپور چلے گئے تھے۔ ان کے والد قاضی برہان الدین حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ سیّد ہاشم، شاہ عبداللہ کی خدمت میں بغرضِ بیعت وارادت حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا: بیٹھو۔ آپ نے کہا میں تو خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ انھوں نے کہا تم میرے بھائی ہو۔ میں تم سے کیسے خدمت لے سکتا ہوں؟ آپ نے کہا میں تو اسی نیت سے حاضر ہوا ہوں اور برابر دست بستہ حاضر رہے۔ چند روز کے بعد شب کو انھوں نے دیکھا کہ حضرت شاہ عبداللہ فرما رہے ہیں کہ مجھ میں جو کچھ ہے وہ میں نے تجھے بخشا اور یہ پانچ شغل جس طرح کہ میں کہتا ہوں تم کرو۔ اس واقعہ اور ان اشغال کو شاہ ہاشم نے دکنی زبان میں اس طرح نظم میں ادا کیا ہے۔

ہس ہس سپنے کہیانا نہاں   دیوں تجی سب جے منج ما نہاں
میں بی نم نم سر کو لیتا   کیوں نہ لیو جیو دیوے بیتا
پانچ شغل مکھ آکھیں سائیں   جیوں رے کہوں ہوں چلن تو انہیں
شغل تکفینا کہیا پیو   نہا بڑا یک جانے جیو
جھا لوڑے آپس توں   تیھا لوڑے ساروں توں
تن منہ اپنی صورت دیکھ   آپس تھیں کوئی جوانا لیکھ
شغل الٰہی کی حد جان   بی بی بولو جیو نہ آن
پالو بی تن مت اُبھرائے   ہاشم جی پیو یوں سمجھائے

تھی دو شنبہ کیسری رات   شاہ عبد اللہ آکھی بات

مولوی عبدالحق نے مذکورہ اشعار شاہ ہاشم حسینی علوی کے ملفوظات 'مقصود المراد' مرتبہ شاہ مراد بن سیّد جلال سے نقل کیے ہیں۔ شاہ عبد اللہ علوی نے ساتویں محرم، شب سہ شنبہ میں اسّی سال کی عمر میں بمقام احمد آباد ۱۰۱۷ھ انتقال فرمایا اور اپنے والد ماجد کے مقبرے کے پاس آسودۂ خواب ہیں۔

ماخذ:

۱۔ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار۔ مصنفہ محمد حسن غوثی منڈوی، صفحہ ۲۷۰ و ۲۷۱۔

۲۔ روضۃ الاولیاء بیجاپور، مصنفہ محمد ابراہیم بیجاپوری۔ صفحہ: ۱۱۰۔

۳۔ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ مصنفہ مولوی عبدالحق۔ صفحہ ۳۳۔

سیّد صبغۃ اللہ بھڑوچیؒ

حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کے تلامذہ اور خلفاء میں ممتاز ترین شخصیت سیّد شاہ صبغۃ اللہ بھڑوچی کی ہے۔ آپ کا اصلی وطن بھڑوچ ہے جو اب سورت اور بڑودہ کے درمیان ایک ضلع کا صدر مقام ہے۔ آپ شاہ روح اللہ حسینی کے فرزند ہیں۔ آپ کی والدہ شاہ کمال صوفی حسینی کی صاحبزادی تھیں اور شاہ صاحب حضرت مخدوم سیّد محمد حسینی گیسو دراز کے داماد تھے۔ آپ نجیب الطرفین سادات سے تھے۔ ولادتِ باسعادت ۹۵۲ھ میں واقع ہوئی۔ 'خیر الناس' ولادت کی تاریخ ہے۔ نشوونما وطن میں ہوئی۔ سنِ رُشد کو پہنچے تو احمد آباد میں تعلیم کی غرض سے حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کی خدمت میں آئے۔ نو برس تک تحصیلِ علوم میں صرف کیے۔ علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی سے بیعت کی اور روحانی کمالات اور مدارجِ سلوک حاصل کیے۔ پھر آپ کی خلافت سے سرفراز ہوئے۔ مرشد کی ایماء پر پہلے اپنے وطن بھڑوچ اور اس کے اطراف میں درس و تدریس، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مشغول ہوئے اور اس عمدگی و خوش اسلوبی سے ارشاد و ہدایت کا کام کہ تھوڑی عرصے میں عوام اور خواص آپ سے متاثر ہوگئے۔ حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی آپ کے طرزِ عمل سے بہت خوش ہوئے اور آپ کو جب خط لکھتے تو اس پر آپ کے لیے ''مجد الدین، مخدوم العالمؒ کے القاب تحریر فرماتے۔ عوام

نے 'نائبِ رسول اللہؐ' کا خطاب دیا۔ محمد غوثی نے آپ کی شان میں اپنی کتاب 'گلزار ابرار' میں لکھا ہے کہ ''فضیلت و فصاحت کے قرآن کا آغاز، کشف و کرامت کی کتاب کا خاتمہ، انس کی نفحات کا تکملہ اور صدق و صفا کی رشحات کا سرچشمہ تھے۔'' ہمہ دم حبِ رسول کا غلبہ رہتا۔ کہتے ہیں کہ ایک روز طلبہ کو لے کر سیر باغ کے لیے نکلے۔ ابھی چند قدم چلے نہیں کہ دیارِ رسول کی زیارت کا ولولہ دل میں اُٹھا۔ اسی وقت راستے سے مڑ گئے اور فرمایا کہ مجھے سیر باغ کی ضرورت نہیں اور پھر عازمِ سفر حجاز ہوگئے۔ آپ کی اہلیہ راجی دولت (جو چنگیز خاں گجراتی کی دختر نیک اختر تھیں) نے فوراً ہی زاد و راحلہ کا بندوبست کر دیا۔ چنانچہ آپ اسی وقت مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ پہنچتے ہی حرمین شریفین کی زیارت کی۔ مدینہ منورہ میں روضۂ رسولؐ کے نزدیک قیام کیا۔ پھر کچھ دنوں رہ کر وطن کی طرف لوٹے۔ غوثی نے 'گلزار ابرار' میں لکھا ہے کہ جب آپ کو حرمین کی بہشت نما زمین سے آب و دانہ کی کشش، صلۂ رحم کی رعایت اور فرزندوں اور اہلِ وطن کی محبت ہند میں لائی تو یہاں بھی اسی کی یاد میں بیتاب رہا کرتے، دل ہی دل میں کہا کرتے کہ

کے بود یا رب کہ رو ، در یثرب و بطحا کنم
گہ بمکّہ منزل و گہ در مدینہ جا کنم

مدینہ اور دیارِ حبیب کی یاد دل میں ہمیشہ کروٹیں لیتی رہتی۔ چنانچہ تھوڑے دن وطن میں قیام کیا اور پھر ۹۹۹ھ میں اپنے وطن کے لوگوں کو خیرباد کہہ کر بے اختیار تن تنہا مالوہ میں چلے آئے۔ یہاں بھی چین نہ آیا۔ ۱۰۰۰ھ میں خاندیس کے راستے سے احمد نگر دکن میں پہنچے۔ اس ملک کے فرمانروا برہان الملک نے بہت کچھ منت سماجت کی تو قریب ایک سال وہاں ٹھہرے۔ غوثی کہتے ہیں کہ ''راقم ماجرائے درویشاں ان ایام میں اس مقام پر فقراء و فضلاء کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کر رہا تھا۔ نیز شعراء و ظرفاء کی صحبت میں بھی شاملِ نشاط و طرب ہوا کرتا تھا۔ آپ کی تشریف آوری نے دونوں کو غربت اور تنہائی کے اندوہ سے نجات بخشی، اور چند روز مصاحبت غنیمت سمجھی گئی۔

چند روزے کہ غمت مونس جاں بود مرا
خاطر جمع و دل شاد بماں بود مرا

یہاں بھی دیارِ رسول کی یاد نے بے قرار کیا تو فرطِ شوق میں دوسرے سال سامانِ سفر باندھ کر تیار ہوگئے۔ جب بیجاپور پہنچے تو یہاں کے فرمانروا ابراہیم عادل شاہ نے بڑی خاطر تواضع کی۔ نہایت عزت واحترام کے ساتھ اپنے یہاں ٹھہرایا۔ پھر سفرِ مبارک کا سامان کردیا۔ اور آپ کے لیے خصوصی جہاز پیش کیا۔ آپ کے ہمراہ مریدین ومعتقدین کا قافلہ بھی روانہ ہوا۔ حسبِ خواہش آپ کی مشتاق آنکھوں نے جب آستانۂ نبوی کا دیدار کیا تو آپ نے نیت کرلی کہ بقیہ عمر اسی مدینۂ رسول میں گزاروں گا۔ جبلِ احد کے دامن میں سکونت اختیار کی۔ علمائے حرمین نے اس موقع کو غنیمت جان کر آپ کے فضل وکمال سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ سلطان روم کی جانب سے نامہ وپیام آیا اور بہت کچھ نذر اور وجہِ معاش کی پیش کی گئی مگر آپ نے قبول نہ فرمائی۔ فقر واستغنا اور توکل وتسلیم کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔ آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سرزمینِ حجاز میں طریقۂ شطاریہ عشقیہ کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے نہ صرف درس وتدریس اور ارشاد وہدایت کا غلغلہ بلند کیا بلکہ تصنیف وتالیف کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ آپ نے شیخ محمد غوث گوالیاری کی کتاب 'جواہرِ خمسہ' کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جس پر آپ کے شاگرد شیخ احمد شناوی نے حاشیہ لکھا۔

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی اپنی کتاب 'مآثر الکرام' میں شیخ محمد عقیلہ مکی کی کتاب 'لسان الزمان' کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ 'شیخ کبیر، عالم شہیر سیّد صبغۃ اللہ بن سیّد روح اللہ حسینی شیخ المشائخ طریقۂ شطاریہ عشقیہ ہیں اور وہ تمام علوم ومعارف کے جامع تھے۔ اور ایک عالم کو ان سے نفع پہنچا۔ وہ ایک ایسی ہستی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ظاہر کیا اور یہاں شہرت بخشی۔ ان کے فیض یافتگان میں مدینہ کے عالم سیّد میر اور اسعد بلخی ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں '(۱) کتاب الوحدۃ (۲) رسالہ اراءۃ الدقائق فی شرح مرآۃ الحقائق (۳) ما لا یسع المرید ترک کل یوم من سنن القوم' عربی میں ہیں۔

مولانا سیّد عبدالحیٔ حسنی اپنی کتاب 'یادِ ایام' میں لکھتے ہیں:

''شیخ احمد بن عبدالقدوس شناوی، ابوبکر بن قعود النسفی، محمد بن عمر بن محمد الحضرمی اور شیخ عبدالعظیم المکی جیسے نامور سیّد صبغۃ اللہ کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے تفسیرِ بیضاوی پر حاشیہ لکھا جو بلادِ روم تک پہنچا اور علماء نے اس کو ہاتھوں ہاتھ

لیا۔ اس کے سوا ان کی اور بھی تصنیفات ہیں جو علمائے عرب کی فرمائش سے لکھی ہیں۔ محمد بن فضل اللہ محبی نے خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا اور نجم الدین غزی نے لطف الثمر وقطف الثمر میں ان کی بڑی مدح وثنا کی ہے۔''

انھوں نے بروز سہ شنبہ ۲۶/ جمادی الاولی ۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۷ء کو وفات پائی۔ جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ عمر تریسٹھ سال کی تھی۔ مولانا حبیب اللہ بیجاپوری نے آپ کی رحلت کی تاریخ کے متعدد مادّے استخراج کیے۔ ان میں 'خیر الناس باطناً' کا فقرہ عجیب وغریب ہے۔ مجموعۂ فقرہ سے رحلت کی تاریخ برآمد ہوتی ہے اور 'خیر الناس' سے تاریخ ولادت اور 'باطناً' سے مدتِ عمر مفہوم ہوتی ہے۔ ویسے تو سینکڑوں اشخاص آپ کی توجہ سے علم وعرفان سے آشنا ہوئے اور روحانی مقام حاصل کیے لیکن خلفاء میں حسن فراقی، ملا حبیب اللہ، سیّد میران، شیخ عبدالحلیم، شیخ عبدالعظیم مکی خاص سے مشہور ہوئے۔

ماخذ:

۱۔ اذکارِ ابرار، ترجمہ گلزارِ ابرار، مصنفہ محمد حسن غوثی۔ صفحہ ۴۷۰ و ۴۷۱۔
۲۔ مآثر الکرام۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ صفحہ ۳۰ تا ۳۲۔
۳۔ تذکرۂ علمائے ہند۔ رحمان علی۔ صفحہ ۹۱ و ۹۲۔
۴۔ محبوب الزمن تذکرہ اولیائے دکن۔ عبدالجبار صوفی ملکاپوری۔ صفحہ ۴۶۴ تا ۴۷۰۔
۵۔ روضۃ الاولیاء بیجاپور۔ محمد ابراہیم بیجاپوری۔ صفحہ ۴۴ تا ۴۶۔
۶۔ سفینۃ الاولیاء۔ دارا شکوہ۔
۷۔ یادِ ایام۔ مولانا عبدالحیٔ حسنی۔ صفحہ ۱۶۸ و ۱۶۹۔
۸۔ رودِ کوثر۔ شیخ محمد اکرام۔ صفحہ ۳۹۴۔

شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری

حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کے ممتاز شاگردوں میں شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری ہیں جن کے فضل وکمال کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ آپ کے والد شاہ فضل اللہ (متوفی ۱۵۹۶ء) اپنے زمانے کے مشہور صوفی اور عالم تھے۔ شاہ صاحب کا اصل وطن جونپور تھا لیکن برہانپور میں

مقیم ہو گئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ فقط تفسیر اور حدیث کا درس دیتے تھے اور صوفیانہ ارشاد و ہدایت سے باطنی رہنمائی اور تزکیۂ نفس کا اہتمام کرتے۔

شیخ محمد بن فضل اللہ احمد آباد گجرات کے اندر ۱۵۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی صغیر السن تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ عنفوانِ شباب میں شیخ صفی گجراتی کی خدمت میں جا کر خرقۂ خلاف پہنا۔ شیخ نے آپ کو مکہ معظمہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حرمین شریفین کی زیارت کر کے بارہ سال مکہ معظمہ میں شیخ علی متقی کی خدمت میں رہے۔ وہاں سے واپس ہو کر احمد آباد میں آئے اور شادی کر کے متاہلانہ زندگی گزارنے لگے۔ پھر بارہ سال شاہ وجیہہ الدین گجراتی کی خدمت میں علوم ظاہری کی تحصیل میں گزارے۔ اسی زمانے میں شیخ محمد ماہ جونپوری کی صحبت میں پہنچے۔ شیخ محمد ماہ کو خلافت کا خلعت اور اجازت شیخ ادہن بن شیخ بہاء الدین جونپوری کی خدمت سے ملا تھا۔ شیخ ماہ نے اپنے والد سے چونکہ سنا تھا کہ ہمارا چھوٹا لڑکا قطب ہوگا اس لیے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ شیخ ابو محمد خضر تمیمی نے جو آپ کے والد کے اسیر تھے قلعہ آسیر سے ایک خط شیخ وجیہہ الدین اور شیخ ماہ کو لکھ کر بھیجا کہ شاہباز کو پرواز میں کیوں نہیں لاتے۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ آپ کے اختیار میں ہے اور شیخ کو مستقل اجازت دے دی۔ شیخ نے شیخ ابو محمد کی خدمت میں پہنچ کر وہ نعمت جو آپ کے والد نے شیخ ابو محمد کے پاس رکھ دی تھی حاصل کر لی۔ اور برہان پور کو اپنا وطن بنایا۔ غوثی نے 'گلزار ابرار' اس زمانے میں تصنیف کی جب آپ ابھی حیات تھے۔ لکھتے ہیں کہ:

''آپ خاندیس کے بادشاہ محمد شاہ ابن مبارک شاہ فاروقی کے عہدِ حکومت (۱۵۶۶ء) میں گجرات سے خاندیس تشریف لائے۔ برہانپور میں مسجد اور خانقاہ تعمیر کی۔ حدیث، تفسیر اور دوسرے دینی علوم کا درس دینے میں مشغول رہتے ہیں۔ بہت سے طالب آپ کی رہنمائی کی برکت سے حق شناسی کے درجے کو پہنچ گئے۔ تسلیم، توکل، تقویٰ اور ظاہری و معنوی فضیلتوں کے مالک ہیں۔ اہلِ دل ہیں لیکن سماع اور سرود سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ عاشق رسول ایسے ہیں کہ ہر سال جہاز کے موسم میں دیوانہ وار وطن سے نکلتے اور سمندر کے

کنارے پر پہنچ جاتے۔ اگر قسمت یاوری کرتی تو جہاز پر سوار ہو کر حرمین شریفین میں پہنچتے اور روضۂ نبوی کی زیارت سے دل کو تسکین دیتے۔ اس طرح آپ نے حجاز کے کئی سفر کیے۔ وطن میں بھی محبتِ رسولؐ میں مست رہتے۔ سال بھر میں اگر کوئی کوڑی پیسہ بچاتے تو اس لیے کہ سفر حجاز کا سامان ہو جائے یا ربیع الاوّل میں مجلسِ میلاد پورے اہتمام سے ہو۔ ربیع الاوّل کے پہلے بارہ روز مجلسِ میلاد قائم ہوتی۔ ہر رات کو ذاکرین احادیثِ نبوی اور نعتیں سوزناک آواز سے پڑھتے اور آپ اپنا سارا اندوختہ مجلس میں تبرکات، حلوے اور عطریات تقسیم کرنے اور ذاکرین کی خدمت میں صرف کر دیتے۔ اگر کچھ زیادہ ہوتا تو حرمین کے فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے بھیج دیتے۔''

آپ کے عشقِ رسولؐ اور محبت و شیفتگی کی بڑی شہرت تھی۔ شاہجہاں بزمانۂ شاہزادگی جب وہ نوجوان تھا جب برہانپور آتا تو شیخ محمد بن فضل اللہ سے بکمالِ عقیدت و خلوص ان کی خانقاہ میں حاضر ہو کر ملتا اور ان ملاقاتوں سے وہ اتنا متاثر ہوا تھا کہ بادشاہ ہو جانے کے بعد بھی بار بار ان تاثرات کا ذکر کرتا تھا۔ ملا عبدالحمید لاہوری 'بادشاہ نامہ' میں لکھتے ہیں:

''بار بار شہنشاہ فرمایا کرتے تھے کہ اگرچہ میں ہندوستان جنت نشان کے بہت سے صاحبِ ریاضت بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں لیکن روحانیت کے درجۂ کمال پر دو ہی ہستیاں پائیں؛ ایک میاں میر لاہوری اور دوسرے شیخ محمد بن فضل اللہ جو برہان پور میں مقیم ہیں۔''

برہانپور میں شیخ پہلے کچھ دنوں تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ پھر درس و تدریس چھوڑ کر یادِ خدا اور خلق کی رہنمائی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ لیکن تصنیف و تالیف کی دنیا میں بھی آپ کا نام بلند ہے۔ آپ کا اصل شاہکار 'التحفۃ المرسلہ الی النبیؐ' ہے لیکن اور کتابیں بھی ملتی ہیں مثلاً 'التحفۃ المرسلۃ' کی شرح آپ نے 'الحقیقۃ الموافق الطریقۃ' کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کی ایک نقل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہے۔

آپ نے ۱۶۲۰ء میں وفات پائی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مخلص و معتمد خلیفہ

(مکتوباتِ امام ربانی جلد سوم کے مؤلف اور زبدۃ المقامات کے مصنف) خواجہ محمد ہاشم کشمی ثم برہانپوری نے تاریخ لکھی۔

مظہر اسمائے سمی مصطفیٰ — آنکہ از نامش زباں چوں گل شگفت
سینہ اش شق آمد آخر از جہاں — بس کہ راز عشق در وے می نہفت
ابن فضل اللہ بود و ہاتفے — سال فوتش ابن فضل اللہ گفت

شیخ اکرام 'رودِ کوثر' میں لکھتے ہیں:

''بارگاہِ الٰہی میں آپ کی محبت نبوی مقبول ہوئی۔ اور آپ کی 'التحفۃ المرسلۃ' نے بہت شہرت پائی۔ اس کی کم از کم تین شرحیں لکھی گئیں اور انڈونیشیا میں اس کا بہت چرچا تھا۔ ملائی زبان کے ایک اہلِ قلم نور الدین رانیری نے اس کا ترجمہ ملائی زبان میں کیا۔ رانیری (راندیری) ہندی النسل تھا لیکن جزائر شرقی میں بس گیا تھا اور اس نے کثرت سے ملائی زبان میں کتابیں لکھیں۔ اس کی تاریخِ وفات معلوم نہیں لیکن اس کی کتابوں کا زمانۂ تصنیف ۱۶۳۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ غالباً انہی کی 'الرحیق المحمدیۃ فی الطریقۃ الصوفیۃ' کا ذکر مولانا عبدالحیٔ صاحب نے 'یادِ ایام' میں کیا ہے۔ اس میں تاریخ وفات ۱۰۶۸ھ یعنی ۱۶۵۷ء لکھی ہے۔''

ماخذ:

۱۔ اذکارِ ابرار، ترجمہ گلزارِ ابرار۔ مصنفہ محمد حسن غوثی منڈوی۔ صفحہ ۵۹۷و۵۹۸۔
۲۔ سفینۃ الاولیاء۔ مصنفہ دارا شکوہ۔ صفحہ ۲۳۵و۲۳۶۔
۳۔ بادشاہ نامہ، جلد اوّل، حصہ دوم۔ مصنفہ ملا عبدالحمید لاہوری۔ صفحہ ۲۳۱۔
۴۔ رودِ کوثر۔ مصنفہ شیخ محمد اکرام۔ صفحہ ۳۹۶و۳۹۷۔

قاضی جلال الدین ملتانی

قاضی جلال الدین ملتانی کا شمار عہدِ اکبری کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔ نہایت متبحر، حق گو اور حق پرست عالم تھے۔ سندھ کے علاقۂ بھکر میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں پروان چڑھے۔ تحصیلِ

علم کے لیے احمد آباد آئے اور شیخ وجیہ الدین علوی سے علومِ دینیہ میں تکمیل کی۔ اس کے بعد آگرہ پہنچے۔ شیخ جلال بن عبداللہ اکبرآبادی سے بھی استفادہ کیا۔ علومِ ظاہری کے ساتھ فقر و تصوف کے بھی لذت شناس تھے۔ برسوں گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر متوکلانہ زندگی بسر کی۔ اس کے بعد کچھ دنوں تجارت کی اور اس سے روزمرہ کی ضروریات بہم پہنچاتے۔ لیکن علمی تبحر اور خداداد صلاحیت کہاں چھپتی ہے.... ان کی فقہی بصیرت اور طریقۂ درس کی شہرت پھیلنے لگی۔ لوگ ان کے پاس آنا شروع ہو گئے۔ بے شمار لوگوں نے آپ کی بابرکت صحبت میں رہ کر علوم و فنون کی تحصیل کی۔

قاضی کمال الدین یعقوب کردی فقہ کے اصول اور فروع کے اندر اس زمانے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے اور بہت زمانے تک شہنشاہ جلال الدین اکبر کے لشکر کے قاضی رہے تھے۔ جب وہ معزول کر دیے گئے تو شہنشاہ کی نظر آپ پر پڑی اور آپ کو لشکر کی قضا کا منصب عطا کیا گیا۔ اس کے بعد ترقی کر کے اقضی القضاۃ کے منصب پر پہنچے۔ دیانت و امانت، عدل و انصاف اور تقویٰ کے اوصاف سے آراستہ تھے۔ ایک مدت تک نہایت حسن و خوبی سے اس فریضے کو انجام دیا۔

اسی زمانے میں شہنشاہ اکبر کا دربار مختلف الخیال علماء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ آئے دن دینی مسائل پر بحث و مناظرہ کی نوبت آ جاتی۔ اس کے علاوہ خود شہنشاہ کے عقیدے میں ایسی باتیں پیدا ہو گئی تھیں جو قاضی جلال الدین کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے خیال میں ان کی حق گوئی اور شہنشاہ اکبر کے مذہبی خیالات پر ناپسندیدگی نے شہنشاہ کو ان سے بدگمان کر دیا اور سازش کر کے ان پر خیانت کی تہمت لگائی گئی اور وہ اپنے عہدے سے معزول کیے گئے۔ بدایونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنی ذات میں تو بلاشبہ نہایت متدیّن تھے لیکن ان کا لڑکا ناخلف اور بددیانت تھا۔ محکمے کے تمام وکیل بھی انتہائی بدنفس تھے۔ ان کی ناشائستہ حرکتوں کی لپیٹ میں وہ بھی آ گئے۔ چونکہ اہلِ زمانہ کے ساتھ زمانہ سازی کی صلاحیت نہیں تھی اس لیے بادشاہ نے ان کو دکن کی طرف جلاوطن کر دیا۔ دکن والے ان کی حق گوئی اور دینِ حق پر ثابت قدمی کا ذکر پہلے سن چکے تھے، اس سبب سے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی قدر و منزلت ہوئی۔

غوثی 'گلزارِ ابرار' میں لکھتے ہیں کہ:

''ایک مدت تک تو زمانے کی گردش شریعت کے طریقے پر رہی۔ جب

علماء وفضلاء خود غرضی اور خود نمائی کے لیے آپس میں لڑنے لگے تو وہاں کا رنگ ہی بدل گیا۔ فقہی اور اجتہادی امور میں باہمی نزاع پیدا ہوا۔ تنقیح حق کے بجائے ایک دوسرے پر فوقیت جتانے لگے تو پہلے شہنشاہ نے اس اختلاف ونزاع کی اصلیت کی طرف توجہ نہ کی۔ شک و بدگمانی کی فضا میں صلح کل کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ طریقہ بلاشبہ بہترین طریقہ ہے لیکن اس طریقے کو کرسی پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس لیے انھیں چند متعصب وتنگ نظر علماء کی صحبت میں بے لطفی کا شربت پینا پڑا۔ یعنی شہنشاہ نے خود رائی سے اس گروہ کو جدا جدا مختلف اطراف میں منتشر کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ سلطنت کی نوعروس کے گلے میں موتیوں کا ایک ہار تھا جس کو غصے کی حالت میں نادانی کے ہاتھ نے توڑ کر موتیوں کا ایک ایک دانہ الگ الگ کر کے بکھیر دیا۔ القصہ اس سلسلے میں آپ کی روانگی بیجاپور دکن کی طرف ہوئی۔ آپ نے ایک مدت تک اس جگہ زندگی بسر کی۔ اس صوبے کا حاکم آپ کی تعظیم وتوقیر حد سے زیادہ عمل میں لایا۔''

دکن سے آپ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ معظمہ میں ۹۹۹ھ میں اسی سرزمین میں انتقال فرمایا۔

ماخذ:
۱۔ منتخب التواریخ۔ مصنفہ ملا عبدالقادر بدایونی۔ صفحہ ۳۰۵۔
۲۔ طبقات اکبری۔ مصنفہ خواجہ نظام الدین احمد۔ صفحہ ۴۶۰۔
۳۔ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار۔ مصنفہ محمد حسن غوثی۔ صفحہ ۴۰۹ و ۴۱۰۔
۴۔ نزھۃ الخواطر۔ مصنفہ مولانا سید عبدالحئی۔

حکیم عثمان بوبکانی

آپ کے پدر بزرگوار کا نام شیخ عیسیٰ بن ابراہیم صدیقی ہے۔ آپ کی ولادت سیوستان سندھ کے ایک گاؤں بوبکان میں ہوئی۔ حصول علم اور خدا طلبی کا شوق ابتدائے جوانی میں کشاں کشاں مرکزِ علم وفن احمد آباد گجرات میں لے آیا۔ سرآور علماء وسرخیلِ صوفیہ حضرت مولانا وجیہہ

الدین علوی اور صوفی صافی قاضی محمود موربی کی خدمت میں رہ کر علوم معقولات ومنقولات اور اسرار شریعت کی تحصیل کی۔ ان فاضل اساتذہ کی توجہ اور تربیت سے درجہ کمال حاصل کیا۔ ریاضی وحکمت میں حضرت شیخ حسین بغدادی سے سند لی۔ پھر ان کی صلاحیتیں جو چمکیں تو علوم متداولہ اور فنونِ حکمت میں استاد زمانہ کہلائے۔ بقول غوثی: ''علمائے وقت میں سے کوئی عالم ہر ایک فن کے مبادی اور مسائل کی تحقیق اور دقیقہ شناسی میں آپ کے رتبے کو نہیں پہنچا۔''

کہتے ہیں کہ علمی میدان میں یہ کامرانیاں حکیم عثمان کے ذوقِ طلب کے علاوہ سندھ کے ایک باخدا بزرگ حضرت مخدوم نوح ہالہ کنڈیؒ کی دعا کا بھی فیض واثر ہے۔ جملہ علوم میں کمالات کے بعد آپ نے تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ آپ کے فضائلِ علمی اور کمالاتِ روحانی کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ۹۸۳ھ میں برہان پور تشریف لائے۔ بادشاہِ وقت محمد شاہ بن مبارک شاہ فاروقی نہایت عزت واحترام کے ساتھ پیش آیا۔ درس وفتویٰ نویسی کے اعلیٰ منصب پر آپ کو مامور فرمایا۔ نیز آپ کے شایانِ شان نقد نذرانے کے علاوہ زرخیز آراضی کا ایک موضع جو برہان پور سے چند میل کے فاصلے پر ہے، آپ کو مرحمت کیا۔ اس وقت سے لے کر بقیہ عمر تک کامل ستائیس سال آپ نے درس وتدریس، فتویٰ نویسی اور تصنیف وتالیف کے ذریعے اپنا فیض جاری رکھا۔ آپ کے فیض یافتگان میں بڑے بڑے علماء، محدثین، مفسرین اور یگانہ روزگار ہستیاں ہیں۔

جس زمانے میں آپ کا درس برہانپور میں شروع ہوا تو حضرت عیسیٰ جند اللہ اپنے چچا شیخ طاہر محدث سے تعلیم پا کر مزید حصولِ علم وکمال کی تلاش میں برہانپور سے باہر جا چکے تھے اور آگرہ میں شیخ جلال الدین ملتانی کی خانقاہ میں مقیم تھے کہ آپ کے چچا نے لکھا کہ تم جیسے تبحر عالم کو چاہتے تھے وہ برہانپور میں آگئے ہیں۔ میرے خط کو دیکھتے ہی واپس آجاؤ۔ اس کے بعد شیخ عیسیٰ جند اللہ واپس آ کر حکیم عثمان بوبکانی کے درس میں شامل ہوئے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ میں قرأت وسماع سے بہرہ یاب ہوئے۔

گلزار ابرار کا مصنف غوثی کبھی کبھی برہان پور آنے والا بڑے فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ

''راقم گلزار ہیئت اور حکمت کی چند کتابیں آپ سے پڑھنے کا شرف رکھتا ہے۔''

قاضی عبدالسلام سندھی عادل شاہ فاروقی (۹۸۴ھ تا ۱۰۰۵ھ) ان کے عہد میں مسند قضا پر متمکن تھے اور بذات خود اس علمی منزلت سے فائز تھے کہ انھوں نے مختصر وقایہ پر مبسوط شرح لکھی ہے، حکیم عثمان کے شاگرد ہیں۔

شیخ صالح سندھی جو شائستہ اطوار اور جوہرِ علم و عمل سے آراستہ تھے، آپ کے شاگردِ رشید تھے اور آپ نے انھیں فرزندی میں لے کر دامادی کا شرف بھی بخشا تھا۔

قاضی نصیرالدین ابن سراج محمد جبانی برہانپور کے ممتاز عالم اور سربرآوردہ ہستی تھے۔ حکیم عثمان کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا کرتے تھے۔

شیخ سکھ جی حضرت یوسف بنگالی کے داماد بھی حکیم کے شاگرد تھے جو اپنے خسر کی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر داخلِ درس ہوئے تھے۔ شیخ یوسف بنگالی کا مدرسہ برہانپور میں اعلیٰ علوم کی تعلیم میں ممتاز و معروف تھا۔

یہ چند نام ہیں جو آپ کے نامور اور ممتاز شاگردوں کے ہیں۔ ستائیس برس میں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس سرچشمۂ علوم و فنون سے کتنی فیض رساں نہریں جاری ہوئیں اور کہاں کہاں اہلِ ذوق کی آبیاری کرتی رہیں۔

محمد حسن غوثی نے گلزار ابرار میں آپ کی تصنیفات کے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے:

''آپ کی تصنیفات بہت سی ہیں، منجملہ ان کے تفسیر قاضی بیضاوی کا حاشیہ اور بخاری کی شرح؛ یہ دو کتابیں نہایت مشکل نما اور دشوار کشا ہیں۔''

آپ نے برہانپور میں تین فاروقی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور ہر بادشاہ نے قدر و منزلت زیادہ سے زیادہ کی۔ محمد شاہ فاروقی آپ کے تقرر سے ایک سال بعد فوت ہوگیا۔ اس کے بعد راجے علی خاں عادل شاہ کے لقب سے تخت نشیں ہوا۔ اس نے بھی منصب و وظیفہ کو اضافہ کے ساتھ برقرار رکھا۔ اس کے انتقال کے بعد ۱۰۰۵ھ میں بہادر خاں بادشاہ ہوا۔ گرچہ وہ ناگفتہ بہ حالات میں تخت نشیں ہوا لیکن آپ کے اکرام و اعزاز میں کوتاہی نہ کی۔

۱۰۰۸ھ میں آپ اپنے جاگیری موضع پر تشریف لے گئے تھے کہ اسی زمانے میں شہنشاہ اکبر نے تسخیر خاندیس کی غرض سے برہانپور اور قلعہ آسیر کے اطراف میں اپنی فوجیں پھیلا دیں۔

لشکرِ جرار کی وجہ سے عجیب انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ آپ نے برہانپور واپس آنا مصلحت نہ سمجھا۔ آپ اپنے موضع پر مقیم ہی تھے کہ ماہ شعبان میں اس نواح کے رہزنوں کا ایک گروہ جو کولیوں میں تھے، ننگی تلواریں اور نیزے لیے اس موضع پر حملہ آور ہوا۔ مال و متاع لوٹ کر آپ کو مع سترہ رفقاء کے بیدردی سے شہید کر ڈالا۔ غوثی لکھتے ہیں کہ ''خون میں بھری ہوئی جانمازیں ان کے کفن ہوئیں۔''

آپ کے تقویٰ و عبادت گزاری کی شہادتیں بڑے بڑے بزرگوں نے دیں۔ شیخ لشکر محمد عارفؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''حکیم کے مثل سکون و آرام کے ساتھ نماز گزار مجکو بس حکیم ہی نظر آئے۔''

شیخ طاہر محدث ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ:

''جیسی شکستگیٔ خاطر، خوشی، عاجزی اور گمنامی حکیم نامی کی ہے، میں نے عالموں میں سے کسی میں بھی نہیں دیکھی، چالیس سال کے اندر کسی کے گھر کا لقمہ نہیں کھایا۔ کمال پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کی۔''

ماخذ:

۱۔ اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار۔ مصنفہ محمد حسن غوثی۔ صفحہ ۴۳۵ و ۴۳۶۔

۲۔ برہانپور کے سندھی اولیاء۔ مصنفہ سید محمد مطیع اللہ راشد برہانپوری۔ ۲۱۶ تا ۲۲۱۔

شیخ یوسف بنگالی

درسی علوم میں یکتائے زمانہ اور طریقۂ تدریس میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ بڑے بڑے جید علماء اور باکمال شخصیتوں نے آپ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کی۔ محمد حسن غوثی آپ کے معاصر اور آپ کی خوبیوں کے بڑے مداح ہیں۔ آپ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

''قرطاسی علوم کے واسطے آپ کا دل کتابوں کا صندوق تھا۔ اور آپ کی زبان مجلد کتابوں کی دکان تھی۔ آپ نے آغاز جوانی میں عرفی علم کی تحصیل کے واسطے اپنی زاد بوم سے غربت اختیار کی تھی۔ مہربان استاد کی تلاش میں ایک

شہر سے دوسرے شہر، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں چلے پھرے۔ بالآخر ازلی ہدایت نے آپ کو احمد آباد گجرات میں حضرت شاہ وجیہ الدین علوی کی خدمت میں پہنچایا۔ جب تمام عقلی اور نقلی فنون کی تحصیل کر لی تو شیخ علوی کی خدمت سے برہان پور جانے کی اجازت ملی۔ آپ برہان پور پہنچ کر شیخ سالم کی ہمسائیگی میں گوشہ اختیار کیا۔ علم طب میں شیخ سالم کے بیان کو جالینوسی حکم اور نفس کو مسیحائی حکم حاصل تھا۔ چند روز بعد شیخ سالم نے اپنی لڑکی آپ کے نکاح میں دے دی۔ گھر اور سامان دونوں بہم پہنچ گئے۔ بہت مدت تک آپ نے درس دیا لیکن تصوف کی تعلیم سے احتراز کیا کرتے تھے۔ اگر خواہش مند اور شائق ضد کر بیٹھتا تو آپ اس کو حقیقت آگاہ شیخ طاہر یوسف سندھی کے درس میں بھیج دیا کرتے تھے۔ مسیح القلوب (شیخ عیسیٰ جند اللہ) بعض علوم میں اور دریائے فضیلت و کمال شیخ پیر محمد حلیم اکثر علوم میں آپ کے شاگرد ہیں۔ شیخ پیر محمد آج کل کے زمانے میں اس درجے کے آدمی ہیں کہ خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے، باہر سے آنے والے مسافر ہوں یا یہاں کے رہنے والے مقیم، ان کے درس سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ ایک روز شیخ یوسف کے داماد شیخ سکھ جی نے جو حکیم عثمان بوبکانی کے شاگرد ہیں، مسیح القلوب کی خدمت میں عرض کیا "میرے خسر نے واپسیں سفر کے وقت وصیت کی تھی کہ میرے فرزندوں کو حقائق نثار، حقیقت آگاہ شیخ طاہر بن یوسف کے درس میں تبرکاً جا کر دو تین حرف پڑھ لینا چاہیے۔ اس پڑھنے کا اثر اخیر میں ظاہر ہوگا۔ اب آپ کے دو فرزند عبد اللہ اور عبد الرحمٰن نے چونکہ پدر بزرگوار کی وصیت پر عمل کیا اس واسطے ان کو علم، فضیلت، حق شناسی اور خدا پرستی یہ جملہ صفات حاصل ہوگئی ہیں۔ یوسفی خوابگاہ برہانپور میں ہے۔ مصرع:
علومش رہنمائے عین حق باد۔"

(اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار۔ ص: ۳۵۸ و ۳۵۹)

مولانا عثمان سنبھلی

شیخ فاضل عثمان بن ابو عثمان حنفی بنگالی ثم سنبھلی اپنے دور کے مشہور عالم، بنگالہ میں پیدا ہوئے مگر علم کی طلب میں سنبھل (ضلع مراد آباد) آ پہنچے۔ اور شیخ حاتم سنبھلی سے پڑھ کر گجرات تشریف لے گئے۔ وہاں پر ہی سکونت اختیار کر لی۔ یہاں علامہ وجیہ الدین گجراتی سے اکتساب کے بعد سنبھل لوٹ کر طرح اقامت ڈال دی۔ (بروایت کمال محمد سنبھلی در 'اسراریہ')

ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ پہلے شیخ حاتم مذکور سے آپ نے پڑھا۔ وہ ان کے پاس آ کر آخر کتاب پڑھ کر سنا دیتے۔ بدایونی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی صغر سنی میں انھیں دیکھا اور شیخ حاتم کے ساتھ ان کی مجلس میں باریاب ہوا۔ سنبھل ہی میں ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء کے اندر وفات پائی۔ ایک صاحب نے ان کی تاریخ رحلت میں 'ہمہ گفتند رفت مردانہ' کہے۔

(نزھۃ الخواطر۔ مصنفہ مولانا سید عبد الحی حسنی)

شیخ عبد اللہ صوفی شطاری اکبر آبادی

آپ کمال الدین بہلول بن چاند بن جنید بن محمد بن برہان الدین بن عز الدین محمود بن نجم الدین احمد بن مولانا شمس الدین ہردی عثمانی کے فرزند رشید ہیں۔ آپ کے کسی قدر حالات اس طرح پر ہیں۔

نماز عصر کے وقت بروز دوشنبہ بتاریخ ۱۲ ربیع الثانی ۹۰۴ھ آپ کی ولادت قصبہ سندیلہ میں ہوئی۔ چونکہ خدا طلبی کا جوہر موجود تھا اس لیے نو سال کی عمر میں ارادت کا شوق پیدا ہوا۔ مخدوم شیخ صفی سائی پوری کے مرید ہوگئے اور سولہ برس کی عمر میں تحصیل علم کے لیے گھر سے باہر نکل پڑے۔ قصبہ گوپامئو میں شیخ الہداد بن سعد اللہ عثمانی کی خدمت میں پہنچے جو ماں کی طرف سے اپنے ہوتے تھے۔ اور صرف و نحو پڑھنا شروع کیا۔ اس کے بعد ایک بشارت کی بنا پر شیخ بدر الدین بدایونی کے روضے پر چھ ماہ مجاور بنے۔ وہاں سے دہلی گئے اور خواجہ قطب الدین اوشی چشتی کے حظیرہ میں رہے۔ شیخ معز الدین بخاری سے استفادہ کیا اور اس خانقاہ کے مدرس سے نحو میں کافیہ، لب، ارشاد کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد خواب میں دیکھا کہ حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ

علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مولانا برہان الدین ملتانی حصار میں تمھارے پہنچنے کے منتظر ہیں۔ ان کے درس میں جا کر تحصیلِ کمال کرو۔ آپ نے تعمیلِ حکم کی اور پھر چند روز کے بعد مولانا نے احمد آباد گجرات کا عزم فرمایا تو آپ بھی ہمراہ ہوگئے۔ اکثر علومِ عربیہ کی کتابیں اور تفسیر مولانا کی ملازمت میں رہ کر پڑھیں اور شرح مواقف، شرح مقاصد الٰہیات اور بعض دیگر ریاضی کے رسالے شیخ وجیہہ الدین احمد علوی شطاری سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ بزودی، ہدایہ فقہ اور عضدی وغیرہ کتابیں شیخ مبارک دانش مند شطاری گوالیاری کے سامنے حل کیں۔ علم حدیث اور اصولِ حدیث میر عبد الاوّل دولت آبادی سے حاصل کیا اور فصوص کی اجازت مولانا مصطفیٰ رومی سے لی۔ بالآخر چوبیس برس کی عمر میں جب تعلیم مکمل کر لی تو عجیب جذبہ پیدا ہوا۔ تمام کتابیں لوگوں کو تقسیم کر دیں۔ گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر اصلاحِ نفس میں مصروف ہوگئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد معرفتِ الٰہی کا ایسا غلبہ ہوا کہ تمام حواس اور قوہ معطل ہو کر رہ گئے۔ حضور خاتم النبوت ﷺ کی طرف توجہ ہوئی کہ کسی ایسے مرشد کا پتہ بتادیں جو نایابی کے درد کا درماں ہو سکے اور جس کے فیضِ ہدایت سے طالبِ عرفاں صاحبِ بصیرت ہو جائے۔ آخرکار حضورؐ نے غوث الاولیاء (غوث گوالیاری) کی خدمت کا راستہ دکھایا۔ حضرت غوثؒ نے دو مہینے کے اندر مشرب عشقیہ کے تمام افکار اور اشغال سکھا کر انوار و اسرار سے بہرہ یاب کیا۔ ۹۵۰ھ میں عرفہ ذی الحجہ کے روز آپ کو تمام خانقاہ نشینوں کا سرحلقہ بنایا۔ تمام صوفیوں کی تلقین آپ کے سپرد ہوئی۔ کامل دس سال تک مبتدی درویشوں کی تربیت آپ کرتے رہے۔ مبتدی درویشوں میں سے جو شخص کمال کے درجے پر پہنچ جاتا تھا حضرت غوث کی خدمت میں عرض کر کے مسندِ ارشاد اس کے سپرد کر دیتے تھے اور کسی نہ کسی سمت کی رہنمائی کے واسطے اجازت ہو جاتی تھی۔

اس اثنا میں غیب سے سامان ہوا تو بیت الحرام کے طواف اور زیارتِ سیّد الانامؐ کے واسطے مامور ہوئے۔ مدینہ منورہ میں پانچ سال تک قیام کیا۔ ریاضت و عبادت میں منہمک رہے اور ہر سال حج کی سعادت بھی حاصل ہوتی رہی۔ پھر احمد آباد واپسی ہوئی۔ وہاں شادی کی۔ پندرہ سال اس شہر میں گزارے۔ ۹۸۱ھ میں پیر کی زیارت کے لیے گوالیار میں آئے۔ یہاں دو سال روضہ کی خدمت کی۔ پھر پیر کے فرمان کے مطابق ۹۸۳ھ کے آغاز میں آگرہ میں جا کر

ٹیامحل گلی میں حجرہ تجویز کیا۔ اور دوشنبہ کے دن نمازِ عصر کے وقت بتاریخ ۲۳؍ جمادی الاوّل ۱۰۱۰ھ کو وصال فرمایا۔ آپ گوشہ نشیں تھے۔ آشنا اور بیگانے کے دروازے پر کبھی نہ گئے اور اسی عبادت خانے میں اپنی خواہش کے مطابق خوابگاہ اختیار کی۔ آپ کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) سراج السالکین بر سنن جواہر خمسہ۔ (۲) اورادِ صوفیہ۔ (۳) رسالہ صوفیہ۔ (۴) انیس المسافرین۔ (۵) اسرار الدعوۃ۔ (۶) شرح رسالہ غوثیہ۔ (۷) رسالہ کنز الاسرار فی حال اشتغال الشطار۔

آپ کے فرزند شیخ عبد النبی ہیں۔ بہت سے علوم میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے پدر بزرگوار کے حالات رسالہ 'جوامع الکلم الصوفی' میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کی یہ تصنیف قابلِ مطالعہ ہے۔ (اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار۔ مصنف محمد حسن غوثی۔ صفحہ ۴۵۴ تا ۴۵۷)

سیّد یٰسین سامانوی

الشیخ العالم الصالح یٰسین بن ابو یٰسین حنفی شطاری سامانوی۔ سیّد شاہ میر سامانوی کے چچیرے بھائی تھے۔ تحصیلِ علم کے لیے شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ ان سے درسیات کے ساتھ طریقت میں بھی استفادہ کیا۔ تکمیل کے بعد حج و زیارت کے لیے شدِ رحال فرمایا اور مشائخِ عصر سے حدیث پڑھ کر ہندوستان واپس ہوئے۔ لاہور میں اقامت فرمائی اور ایک امیر کے ہاں رہ پڑے۔ امراء و حکام کی صحبت میں رہے۔ پھر انھوں نے یہ تعلقات ترک کر دیے۔ دنیا سے کنارہ کش ہو کر کلیتہً اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف رغبت ہوگئی۔ فقراء کا لباس پہن لیا اور سرہند تشریف لے گئے۔ جہاں مدت تک لوگوں کی تربیت کا مشغلہ جاری رکھا۔ کہتے ہیں کہ اپنے چند نیلی پوش خادموں کی نہایت عمدہ تربیت کی۔ وہ پیشوائی میں صاحبِ ادعا تھے۔

ایک دفعہ ان کا ارادہ گجرات جانے کا ہوا تاکہ وہاں سے حجاز چلے جائیں مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تب بنگال تشریف لے گئے اور بہار کی سرحد پر ایک مدت قیام فرمایا اور یہاں بے شمار نفوس مستفیض ہوئے۔ ان میں شیخ محمد بھاگلپوری ہیں۔ یہیں رحلت فرمائی مگر ان کا

سالِ رحلت معلوم نہ ہو سکا۔

ماخذ:

۱۔ اُردو ترجمہ نزہۃ الخواطر۔ مصنفہ مولانا سید عبدالحی حسنی۔ صفحہ ۳۹۶۔

۲۔ منتخب التواریخ۔ مصنفہ ملا عبدالقادر بدایونی۔ فارسی نسخہ۔ صفحہ ۳۱۹ و ۳۲۰۔

۳۔ تذکرہ علمائے ہند۔ مصنفہ رحمان علی۔ فارسی نسخہ۔ صفحہ ۲۵۴۔

قاضی ضیاء الدین نیوتنی

الشیخ الفاضل العلامہ ضیاء الدین بن سلیمان بن سلوٰنی بن عثمانی نیوتنی اودھی۔ علمائے اکابر میں ہیں۔ مولد و منشا نیوتن ہے جو موہان کے نواح میں ہے۔ ابتدائی کتابیں نیوتن میں پڑھ کر گجرات کا سفر کیا۔ وہاں قاضی وجیہہ الدین بن نصر اللہ گجراتی سے پڑھا۔ ممدوح نے اپنی صاحبزادی آپ کے حبالۂ عقد میں منسلک فرمادی۔ ضیاء الدین نے برسوں یہاں اقامت فرمائی اور یہیں سید محمد یوسف قرشی برہان پوری سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی۔ حرمین تشریف لے گئے اور حج و زیارت کے بعد واپس آکر اپنے وطن میں قیام فرمایا۔ افادۂ علوم و معارف میں مصروف ہوگئے۔ آپ سے شیخ جمال کوروی اور دیگر بے شمار افراد نے اکتسابِ علم کیا۔

(اُردو ترجمہ نزہۃ الخواطر۔ صفحہ: ۱۶۵ و ۱۶۶)

شیخ کمال محمد عباسی

آپ کی ولادت احمد آباد گجرات میں ہوئی۔ شاہ وجیہہ الدین علوی کے شاگرد اور خلیفہ ہیں۔ عالم، عارف، عابد، حافظ اور محدث تھے۔ حدیث کی سند شیخ عبدالملک بنبانی سے حاصل کی تھی۔ ۹۸۲ھ میں وطن سے خاندیس کے راستہ اُجین (مالوہ) میں آئے اور یہیں گھر بنالیا۔ شیخ اولیاء کی لڑکی سے شادی ہوئی۔ فتویٰ نویسی کا منصب ملا۔ کامل تیس سال اس مقام پر فقہ و معقولات کا درس دیا اور مفتیٰ بہ روایات پر فتوے لکھے۔ آپ نے اپنی زندگی کا کچھ ایسا نظام الاوقات بنایا کہ کبھی مشغولیت سے خالی نہ رہتے۔ رات اور دن کی تقسیم اس طرح پر کر رکھی تھی کہ رات کا ایک تہائی حصہ باقی رہتا تھا تو اُٹھ کر غسل کرتے تھے اور نمازِ تہجد کے اندر کبھی چھ اور کبھی سات پارہ قرآن پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ صبح کی سپیدی نمودار ہوجاتی تھی۔ پھر دعاؤں اور ذکر

جہر سے فارغ ہوکر نمازِ صبح ادا کرتے تھے۔ پھر اشراق کے وقت تک تلاوت کرتے رہتے تھے۔ اشراق پڑھنے کے بعد زوال تک برابر درس دیتے رہتے تھے۔ پھر اہلِ سبق کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ پھر ایک گھڑی کے اندازہ سے قیلولہ کرکے نمازِ ظہر کے واسطے اُٹھ بیٹھتے تھے۔ نمازِ ظہر کے بعد نمازِ عصر تک لوگوں کی مشکلات، فتویٰ نویسی سے حل کیا کرتے تھے۔ پھر شام کے بعد درویش دوستوں کے ساتھ رازِ تصوف اور تحقیق کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ گیارہ سال کے آغاز سے چون سال تک اسی طریقے پر عمر بسر کی۔ گلزارِ ابرار کے مصنف محمد حسن غوثی کہتے ہیں کہ ۱۰۱۳ھ ایک خط فقیر غوثی حسن کے نام اس مضمون کا بھیجا تھا کہ "بنیادِ عمر نہایت ناپائیدار ہے۔ اعتماد کے لائق نہیں۔ شوق اس بات کو چاہتا تھا کہ مانڈو کے دوستوں کے دیدار کے واسطے میں وہاں آؤں لیکن بعض موانع حارج ہوئے۔ اگر منڈو والوں کو کوئی عذر نہ ہو تو انھیں اُجین کی سیر کرنی چاہیے تاکہ بہم مل کر ایک دوسرے کا دیدار کرسکیں۔" میں حسبِ تحریر آپ کی خدمت میں گیا۔ چند روز حقائق کی عید اور معارف کا نوروز رہا۔ بالآخر اسی سال کی دسویں شعبان کو دوشنبہ کی رات میں، روزانہ رات کے معمول کے مطابق جس قدر ہو سکا اپنے معمولات میں مشغول رہے۔ راقم (غوثی) بھی اس وقت حاضر تھا۔ دو کلموں پر وصیت تمام کی اور رات کے آخر حصے میں ناسوتی مجلس سے منہ پھیر کر ملاءِ اعلیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ خوابگاہ اسی دالان میں اختیار کی جس میں درس دیا کرتے تھے۔ ع: 'یقین میدان کمال از ملک مارفت'۔ (اذکار ابرار۔ صفحہ ۳۶۴ و ۳۶۵)

سیّد عبدالرحمٰن بھروچی

آپ شاہ صبغۃ اللہ حسینی بھروچی کے چچازاد بھائیوں سے ہیں۔ سنِ شعور کو پہنچے تو تحصیلِ علم کا شوق ہوا۔ وطن مالوفہ بھروچ سے احمد آباد میں آئے۔ حضرت مولانا وجیہہ الدین علوی کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ مدت تک حضرت کی خدمت میں رہے۔ درسی کتابوں سے فارغ ہوکے علمِ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت کی توجہ اور برکت سے جامعِ فضائل و کمالات ہوئے۔ اور حضرت کی بیعت و خلافت سے بھی مشرف ہوئے۔ آپ حافظِ قرآن بھی تھے اور عالم و فاضل بھی۔ ابراہیم عادل شاہ کے زمانے میں گجرات سے بیجاپور میں آئے۔ بادشاہ و امراء اور

مشائخ کی خواہش سے وہاں سکونت اختیار کرلی۔ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اکثر طلبہ آپ کے فیضانِ درس سے بہرہ یاب ہوئے۔ آپ کی رحلت ۱۰۱۰ھ میں ہوئی۔ بیرونِ شہر پناہ فتح دروازہ کے متصل مدفون ہوئے۔ آپ کے والد ماجد شیخ احمد محدث بھی اسی مقام پر مدفون ہیں۔ (محبوب ذی المنن تذکرۂ اولیائے دکن، حصہ اول مصنفہ عبدالجبار صوفی ملکاپوری۔ ص: ۶۰۷ و ۶۰۸)

شیخ پیر محمد برہان پوری

والد کا نام عبدالحکیم ابن شیخ جلال قادری ہے۔ برہان پور میں پیدا ہوئے۔ پہلے شیخ یوسف بنگالی کے درس میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد شیخ وجیہہ الدین علوی احمد آبادی کی خدمت میں آئے۔ علومِ رسمیہ کی تحصیل نہایت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ کی۔ ان کے ممتاز اور نمایاں شاگردوں میں گنے جاتے ہیں۔ تحصیلِ علمی کے بعد خود مسندِ درس بچھائی اور آخر دم تک نہایت پابندی کے ساتھ طلبہ کو پڑھایا۔ ان کا معمول تھا کہ نمازِ صبح سے فارغ ہونے کے بعد شام تک طلبہ کے درس میں مشغول رہتے۔ آپ کے مدرسے میں کبھی تعطیل نہیں ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی بدولت بے شمار لوگ درجۂ فضیلت کو پہنچے۔ والیٔ خاندیس آپ کی نہایت تعظیم کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بڑے اکرام کے ساتھ اپنی مجلس میں تشریف آوری کی تکلیف دی اور آپ سے خواہش کی آپ دربار سے متعلق ہوجائیں لیکن آپ نے جواب دیا کہ مجھے ان حضرات کی خدمت سے کہاں فرصت جو دور دراز سے میرے پاس حصولِ علم کے لیے آتے ہیں۔ میرے لیے یہی بہتر ہے کہ جس طریق پر زندگی گزر رہی ہے اسی طریق پر رہنے دیا جائے۔ والیٔ خاندیس نے کہا کہ ہم ہر روز آپ کو بلانا نہیں چاہتے اور نہ افادۂ علمی سے باز رکھنا چاہتے ہیں لیکن اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ جب کبھی موقع ملے تو آپ تشریف لایا کریں۔ آپ خاموش رہے اور پھر مزید گفتگو کا سلسلہ ختم کردیا۔ حضرت عیسیٰ جند اللہ کہتے ہیں کہ پھر آپ دوبارہ والیٔ ملک کے دولت خانہ پر نہیں گئے۔ اور میرے پاس آکر ظاہر کیا کہ اس شرم سے کہ میں بادشاہوں کے دربار میں آیا ہوں دینی دوستوں کے روبرو نہیں ہوسکتا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ "نِعْمَ الْاَمِیْرُ عَلٰی بَابِ الْفَقِیْرِ" (فقیر کے دروازے پر امیر کا آنا بہتر ہے۔) ۱۰۱۳ھ میں وفات پائی۔ خوابگاہ برہانپور میں ہے۔

(اذکارِ ابرار۔ صفحہ ۴۶۹ و ۴۷۰)

شیخ عبدالقادر

آپ ابو محمد بن ابی احمد بن ولی ہاموں بغدادی کے فرزند رشید اور سیّد جمال بھتری کے مرید ہیں۔ بغداد میں پیدا ہوئے۔ ڈھائی برس کی عمر میں یتیم ہوگئے۔ چچا نے پرورش کی۔ نو برس کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا۔ گیارہ سال کے ہوئے تو چچا اپنے ہمراہ بندر گوا لے گئے۔ وہاں چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔ سولہ برس کی عمر تک اسی جگہ رہے۔ ۹۶۹ھ میں جبکہ سلطان مظفر ابن محمود تخت نشیں ہوا احمد آباد گجرات میں آئے۔ چند روز سرکھیج کے مدرسہ میں فقیہ حسن عرب کی خدمت میں عربی ادب کی تحصیل کی۔ اس کے بعد شیخ حسین بغدادی کی خدمت میں معقولات، اور قاضی علاء الدین عیسیٰ احمد آبادی سے علم کلام کی کتابیں پڑھیں۔ پھر جملہ علوم کی تحصیل شیخ وجیہہ الدین علوی کی خانقاہ میں رہ کر کی اور درجۂ کمال حاصل کیا۔ ۹۸۳ھ میں جب شہنشاہ اکبر نے گجرات فتح کیا تو تحصیلِ علمی کے لیے آگرہ بھی گئے۔ شرح تجرید کا قدیم حاشیہ تحریر اقلیدس مجسطی، شرح تذکرہ مولانا نظام اعرج سے پڑھا اور پھر میر فتح اللہ شیرازی کے درس میں شریک ہوکر مہارت فن پیدا کی۔ ملک الشعراء فیضی سے دوستانہ مراسم تھے۔ اس کی خواہش پر اس کے ہمراہ دکن گئے۔

غوثی 'گلزار ابرار' میں لکھتے ہیں کہ راقم (غوثی) بھی اپنے وطن سے ہمراہ ہوکر گیا۔ جب واپسی ہوئی تو آپ اُجین کے اندر ملک الشعراء کے ساتھ رہ گئے۔ اور اسی شہر میں طالبانِ علم کی فیض رسانی شروع کیا۔ ۱۰۲۱ھ تک آپ فیض رسانی کے مسند پر رونق افروز رہے۔ اسی جگہ عقد بھی کرلیا ہے۔ دو لڑکے، ایک لڑکی اس بیوی سے ہیں۔ ابوعلی فیاض اور ابوحسن فیاض نام بھی ہیں۔ اولین فرزند ۱۰۱۹ھ میں عالم روحانی کو کوچ کیا۔ دوسرے فرزند بقید حیات ہیں۔ دیوان متنبّی کے طرز پر انھوں نے عربی قصائد لکھے اور ہر فن کی کتابوں پر حاشیے بھی۔ ایک رسالہ عربی میں ملک الشعراء کے حالات میں ہے۔ ایک رسالہ علم کی تعریف میں متکلم اور حکیم کے طرز پر شیخ ابوالفضل کے نام معنون ہے۔ ع: 'آب حیواں تو امان علم اوست۔'

(اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار۔ مصنفہ محمد حسن غوثی۔ صفحہ ۵۴۸ و ۵۴۹)

شیخ عبداللہ گوالیاری

نام عبداللہ، کنیت ابوالوجیہہ عرف شیخ بدھا اور لقب قطب الاقطاب۔ شاہجہاں آباد میں یوم جمعہ، ماہ ربیع الاوّل ۹۳۸ھ میں ولادت ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی اولاد سے تھیں۔ آپ نے حضرت شیخ وجیہہ الدین علوی احمد آبادی، اور مولانا مبارک دانشمند گوالیاری سے رسمی علوم کی تحصیل کی اور اساتذۂ وقت میں آپ کا شمار ہوا۔ تمام علوم میں درس دیتے تھے۔

۹۷۰ھ میں جب حضرت محمد غوث گوالیاریؒ کا وصال ہوا تو آپ ہی مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ اسی زمانے میں جب اکبر بادشاہ نے چاہا کہ مقبرہ شاہ محمد غوث کی تعمیر کی جائے تو شیخ عبداللہ ہی کو یہ ذمہ داری تفویض کی گئی۔ سیّد فضل علی شاہ نے جہاں شیخ محمد غوث کے فرزندان گرامی کا ذکر کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ مقبرے کی تعمیر شاہ عبداللہ نے کرائی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''پسرانِ حضرت دوازدہ بودند و ہر یک در علم و عمل بے مثل بودند لیکن پسر کلاں قطب الاقطاب شاہ عبداللہ کہ مثل شیخ بودند و جانشین بعہد حیات پیر شدہ بودند و مقبرۂ پدر خود آنحضرت ساختہ۔'' (کلیات گوالیاری قلمی، ص:۱۷)

(یعنی حضرت محمد غوث کے بارہ فرزند تھے اور ان میں ہر ایک بے مثل تھا لیکن سب سے بڑے قطب الاقطاب شاہ عبداللہ بالکل حضرت شیخ کے مشابہ تھے۔ وہ شیخ کی زندگی ہی میں پیر و مرشد ہو گئے تھے اور اپنے والد کا مقبرہ انہی نے بنوایا۔)

اکبر بادشاہ نہیں چاہتا تھا کہ شیخ عبداللہ گوشۂ عزلت اختیار کریں، چنانچہ بقول مولانا محمد غوثی اس نے آپ سے درخواست کی:

''مخدوم زادہ چند روز بحسب ظاہر کمر میں تلوار باندھ کر اولیاء دولت میں شامل رہیں تا کہ آپ کی باطنی توجہ پر ظاہری امدادیں شاید حضرت غوث الاولیاء کی باطنی پرورش کے ثمرات کے برابر ہو جائیں۔ اور سب جگہ اور ہر حال میں آپ کی ہمراہی میرے قلبی سکون کا باعث ہو کر مجھ کو شادکام اور کامیاب کرے۔'' (اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار، ص: ۳۸۸)

سیّد فضل علی شاہ نے بھی لکھا ہے کہ اکبر بادشاہ کو شاہ عبداللہ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اکبر بادشاہ را اعتقاد از قطب الاقطاب بسیار بود۔ جمیع پسرانِ حضرت شیخ (محمد غوث) را جاگیر جداگانہ مقرر کردہ بودند و برائے مدد خرچ مقبرہ جاگیر از پرگنات دتیا قریب سہ لک و بست پنج ہزار روپیہ جدا مقرر کرد۔ نصف شہر کہ بر کنارۂ دریا موسوم بہ غوث پورہ آباد کردۂ حضرت شیخ محمد غوث قدس اللہ سرہ العزیز است و پانزدہ محل دیگر بنا بر نذر و نیاز فرمان شاہی بنام قطب الاقطاب عبداللہ عرف بڑھا نافذ گردیدہ۔ آن جاگیر ہنوز موجود است۔''

(کلیاتِ گوالیاری، ص:۱۷)

(یعنی اکبر بادشاہ کو شیخ الاقطاب شاہ عبداللہ سے نہایت عقیدت تھی۔ حضرت غوث کے تمام لڑکوں کو تو الگ الگ جاگیریں دی گئیں لیکن مقبرہ کے لیے خرچ و امداد میں پرگنہ دتیا اور تقریباً تین لاکھ پچیس ہزار کی رقم الگ دی گئی۔ آدھا شہر غوث پورہ بھی جو دریا کنارے حضرت غوث کے نام نامی پر آباد کیا گیا تھا۔ نیز پندرہ محل نذر و نیاز کے واسطے دیے گئے۔ اس کے لیے فرمان حضرت شاہ عبداللہ کے نام صادر ہوا۔ وہ جاگیر ابھی تک موجود ہے۔)

اس فرمان کے مطابق شیخ عبداللہ چالیس سال تک صورتاً سپاہی اور معناً درویش رہے۔ اکبر نے جب آپ کو مرزا شاہرخ کے پاس سفارت پر بدخشاں بھیجا تو شاہرخ بنفسِ نفیس ایک منزل کی مسافت تک آپ کے استقبال کے لیے آیا اور دولت خانے پر کمال عزت و احترام سے رکھا اور شاہانہ مہمان نوازی کی:

''۱۰۱۴ھ میں جب جہانگیر تخت نشیں ہوا تو آپ نے ضعفِ پیری کے سبب معذرت کر کے دربار سے علیحدگی اختیار کر لی اور ۱۰۱۴ھ سے ۱۰۲۱ھ تک آپ گوالیار ہی میں خلق اللہ کی رشد و ہدایت میں مصروف رہے اور ۱۸ر محرم الحرام ۱۰۲۱ھ میں آپ کا وصال ہوا۔''

(از شاہ محمد غوث گوالیاری۔ مصنفہ پروفیسر محمد مسعود احمد۔ ص: ۸۳ تا ۸۷)

شیخ نورالدین ضیاء اللہ :

آپ شیخ محمد غوث گوالیاری کے صاحبزادے ہیں۔ شریعت میں دل پسند اطوار اور معرفت میں دلآویز گفتار رکھتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی (۱۰۰۴ھ) لکھتے ہیں کہ:

''شیخ محمد غوث کے جانشین ہیں۔ تصوف میں جو اندازِ بیان ان کا ہے صوفیہ میں کم ہی کسی کا رہا ہوگا۔ ان کی محفل میں ہمیشہ معرفت و حقیقت کے متعلق ہی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان باتوں کا موضوع ہمیشہ توحید اور وحدت ہی کا مسئلہ ہوتا تھا۔ محمد حسن غوثی نے تفصیل سے ان کے حالات لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں: ''آپ کی تقریر وجدانِ حقیقت کے بیان میں بڑی دلنواز ہوتی۔ اسرارِ حقیقت کی شراب کا ایسا نشہ ہوتا جس میں چون و چرا کی گنجائش نہ رہتی۔ آپ کی عقدہ کشا زبان صاحبِ عبارت میں رموزِ حقیقت کے چہرہ کا نقاب اُٹھا دیتی تھی۔ آپ کا طریق اور آئین عالم وحدت کے چلنے والوں کو کثرت کی گھاٹیوں سے سلامتی کے ساتھ نکال لے جاتا تھا۔ آپ کی کیمیا اثر نظر سنگدلوں کو موم کرتی اور شکستہ دلوں کے حق میں مومیائی کا حکم رکھتی تھی۔ آپ کی فکرِ سلیم لوگوں کے افعالِ سقیم کو صحت کی طرف پھیر لاتی تھی۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی اور مسافروں کی غمخواری میں پیش پیش تھے۔ ۱۰۰۶ھ تک ان کے حالات بدستور رہے۔ آپ نے جو معمولات بنالیے تھے نوافل، خیرات وصدقات اور ریاضت وعبادات میں کبھی فروگزاشت نہ ہونے دی۔ ۱۰۰۷ھ میں پدر بزرگوار کی رحلت کے بعد گوالیار آئے۔ یہاں پر چند روز مجاورِ روضہ رہ کر آگرہ چلے گئے اور اسی جگہ مقیم ہوکر گھر اور خانقاہ بنائی۔ پینتیس سال خداشناسی کے حجرہ میں چلہ نشیں رہے۔ از روئے ظاہر لوگوں سے میل ملاقات اور جلسوں کی نشست و برخاست کو اپنی خلوت کے جمال کا نقاب بنائے رکھا۔ علم حدیث کے اندر نہروالہ شہر میں کامل دس سال تک شیخ محمد طاہر محدث نہروالہ کی شاگردی کی۔ اور پھر وجیہہ الملۃ علوی احمد آبادی کے درس میں شریک ہوکر تمام علوم وفنون میں

استادِ وقت ہوئے۔ اگرچہ ظاہر میں ظاہری سجادہ نشینی کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن ''الولد سر لابیہ'' (بیٹا اپنے باپ کا بھید ہے) کا فروغ آپ کی پیشانی سے درخشاں تھا۔ جس زمانے میں آپ احادیث کی تصحیح نہروالہ میں کررہے تھے اس زمانے میں احمد آباد کے اندر غوث الاولیاء نے شیخ نور محمد کو خرقۂ خلافت اور اجازت نامہ دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا تھا اور اجازت عطا فرمائی تھی۔''

شہنشاہ اکبر کے وزیر شیخ ابوالفضل کی ان سے دوستانہ راہ و رسم تھی۔ انشائے ابوالفضل میں بھی کئی خط ان کے نام ہیں اور اکبر نامہ میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی شیخ ضیاء اللہ سے دومرتبہ ملے۔ منتخب التواریخ میں دونوں ملاقاتوں کا حال لکھا ہے۔ بدایونی کہتے ہیں:

''پہلے پہل جب ان کے فضائل کا شہرہ بلند ہوا تو میرے سننے میں آیا کہ شیخ اپنے باپ کی مسندِ فقر وارشاد پر جانشین ہوگئے ہیں۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ ان پر فضیلت بھی رکھتے ہیں۔ قرآن شریف کے بھی حافظ تھے اور اس کی تشریح وتوضیح کرتے تو کسی تفسیر سے مدد لینے کی ان کو ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ محمد حسن غوثی بھی ۹۸۲ھ میں آپ سے ملاقات کی غرض سے آگرہ گئے اور پانچ مہینے آپ کی فیض بخشیوں کا حصہ لیا۔''

آپ کی رحلت کے متعلق غوثی 'گلزار ابرار' میں لکھتے ہیں:

''جن دنوں شہنشاہ اکبر لاہور میں تشریف رکھتے تھے ان دنوں ایک دن ہرنوں کی لڑائی کے ہنگامہ میں ایک ہرن کے سینگ کا زخم کاری شہنشاہ کی ران میں لگا۔ شہنشاہ نے چند روز بعد فرمایا کہ اس واقعہ کے اندر ہر جگہ سے تمام اکابر اور امراء آئے تو ہم نے شیخ ضیاء اللہ کی یاد کی، لیکن شیخ نے ہماری یاد نہ کی۔ ابوالفضل نے یہ بات لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجی۔ جب یہ اطلاع آپ کو ملی تو شہنشاہ کی ملاقات کے لیے آپ لاہور پہنچے۔ آپ کی تشریف آوری سے اپنی عافیت اور تندرستی کی فال لی۔ اور پھر چند روز بعد فرمایا کہ شاہزادہ دانیال کی ایک حرم اُمیدوار ہے۔ بادشاہ کی خواہش ہے کہ حرم مذکور شیخ ضیاء اللہ کے مکان

میں رہے تاکہ وضعِ حمل اسی جگہ ہو۔ آپ نے اس حکم کی تعمیل میں دو تین مرتبہ غور کیا مگر قبول نہیں ہوا اور حرم مذکور نے آ کر آپ کے مکان میں وضعِ حمل کیا۔ شیخ اس واقعہ کی اصلیت سے بالکل محترز تھے۔ لہٰذا اپنی زندگانی ہی سے دل تنگ ہوئے۔ ایک ہفتہ بعد مرض الموت پیش آیا اور اپنی جان حوالۂ جاناں کی۔''

(اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار، ص:۴۲۱ تا ۴۲۳۔ منتخب التواریخ، ص:۶۳۹۔ دربار اکبری، محمد حسین آزاد۔ ص:۸۷)

قاضی عبداللہ بیجاپوری:

آپ کا وطن اور جائے پیدائش گجرات ہے۔ آپ کا تعلق مشائخ کے خاندان سے ہے۔ شاہ وجیہہ الدین علوی کے ممتاز شاگرد اور خلیفہ ہیں۔ علم حدیث و فقہ میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے اور تصوف و عرفاں میں بھی یکتائے زمانہ تھے۔ وطنِ مالوفہ سے ابراہیم عادل شاہ کے زمانے میں شہرِ بیجاپور میں آئے۔ مدت تک خلائق کو ارشاد و ہدایت فرماتے۔ حضرت شاہ صبغتہ اللہ حسینی سے بھی استفادہ کیا اور مولانا حبیب اللہ صبغتہ اللّٰہی کے ساتھ رفاقت اور دوستی تھی۔ ۱۰۳۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا مزار حیدرآباد میں فتح دروازہ کے باہر بتایا جاتا ہے جہاں سیّد شاہ راجو ثانی بھی مدفون ہیں۔ ان کی ایک تصنیف 'احکام الصلوٰۃ' بتائی جاتی ہے جس کا اقتباس نصیر الدین ہاشمی صاحب نے 'دکن میں اُردو' کے اندر پیش کیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''اُردو مثنوی کے ارتقاء'' میں بھی ذکر کیا ہے۔

(محبوب ذی المنن تذکرہ اولیائے دکن، مصنفہ عبدالجبار صوفی ملکاپوری۔ ص:۵۸۰۔ روضۃ الاولیاء بیجاپور، مصنفہ محمد ابراہیم بیجاپوری۔ ص:۲۲۰۔ اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء، مصنفہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ص:۲۰۴)

سیّد علی بابا میر حسینی:

سیّد علی نام، بابا میر عرف۔ آپ سیّد السادات سیّد جلال عرف شاہ چندا حسینی کی نسل سے ہیں۔ شاہ چندا کا مزار اگوگی ضلع لنکسور علاقہ حیدرآباد میں ہے اور حضرت مصطفیٰ جنیدی سجادہ روضۂ حضرت شیخ عین الدین گنج العلوم قدس سرہ آپ کے داماد ہیں۔ خلافت، اجازت و بیعت حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی سے حاصل کیا۔ شریعت محمدی و سنت نبوی کا ہر امر میں خیال رکھتے۔ زہد و تقویٰ میں بے نظیر تھے۔ آپ نے ایک مجموعہ درود و صلوات میں ترتیب دیا اور اس میں تقریباً

سات سو درود شریف جمع کیے۔ آپ نے ۱۰۳۰ھ میں رحلت کی۔ آپ کا مزار بیجاپور شہر پناہ کے باہر زہرہ پور میں واقع ہے۔

(محبوب ذی المنن تذکرہ اولیائے دکن، مصنفہ عبدالجبار ملکاپوری۔ ص:۵۸۱۔
روضۃ الاولیاء بیجاپور، مصنفہ محمد ابراہیم بیجاپوری۔ ص:۸۷)

شیخ عبدالملک شطاری سارنگ پوری:

آپ کا وطن سارنگ پور مالوہ ہے۔ شاہ وجیہہ الدین علوی کی کشش احمدآباد لائی۔ شاہ صاحب سے بیعت کی اور خلیفہ ہوئے۔ غوثی 'گلزار ابرار' میں حضرت عیسیٰ بن شیخ قاسم سندھی کے تذکرے کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ آپ کہتے تھے:

''جب میں سارنگ پور پہنچا تو شیخ عبدالملک شطاری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ عبدالملک شطاری شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی کے خلیفہ تھے۔ اور سالک تھے مگر اہل توحید و تحقیق۔ بہت کچھ مہربانی فرمائی اور معرفت کی باتیں بتائیں۔ میرا ایک رفیق تھا جس کا داہنا ہاتھ کارآمد نہ تھا۔ کج تھا۔ جب کھانا سامنے آیا تو اس نے بایاں ہاتھ خرقہ کے اندر سے نکالا اور مذاق سے کہا ''روایت کے بموجب عیسیٰ کے ساتھ اندھا شخص ہونا چاہیے نہ کہ کج ہاتھ والا۔'' تھوڑی دیر اسی قسم کی باتوں سے بہلتا رہا۔'' (اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار، ص:۵۱۱)

سیّد جلال ماہ عالم:

سیّد جلال الدین نام، ابومحمد کنیت، ماہ عالم لقب، سلسلۂ نسب آپ کا اس طرح پر ہے: سیّد جلال الدین بن سیّد حسن بن سیّد احمد عبدالغفور بن سیّد احمد بن سیّد راجو بن حضرت شاہ عالمؒ۔

آپ کی ولادت ۶/ ذی قعدہ ۹۵۹ھ میں ہوئی۔ آپ کی والدہ کا نام خوندا گوہر بنت ملک خضر ہے۔ آپ کی مبارک ذات ایک عرصے کے بعد سلسلۂ عالیہ شاہیہ کو مرتب اور منظم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اور آپ کے سبب سے اس خانوادے کو رونق حاصل ہوئی۔ مختلف انقلاب کے بعد جب اکبر بادشاہ کا قبضہ احمدآباد پر ہوا اور خان اعظم یہاں کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا گیا تو خان موصوف کی کوشش سے آپ کو اس خانقاہ کی سجادگی عطا کی گئی۔ آپ مرید اور خلیفہ شیر محمد

بن احمد بن سید عرب شاہ بن حضرت سید راجو کے تھے اور تصوف کے تمام منازل انھی سے طے کیے تھے اور علوم ظاہریہ شیخ وجیہہ الدین سے تعلیم پائے۔ آپ کے خوارق اور کرامات بہت ہیں۔

آپ کی نسبت ایک واقعہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میر ابوتراب ولی شیرازی نے کچھ لوگوں کی دعوت کی۔ آپ بھی شرکت کے لیے مدعو تھے۔ یہ موسم سرما کا تھا اور سخت تیز اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ آپ جب گھر سے شرکت کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں سائل ملے اور کپڑے کا سوال کیا۔ آپ نے عطا فرمایا۔ اور ایک ہی کپڑا زیب تن کیے ہوئے مجلس میں تشریف لائے۔ لوگوں نے اس کو دیکھ کر محسوس کیا۔ میر ابوتراب نے بطور اشارہ کے اپنے سکریٹری سید امین محمد سے کہا کہ ”سید صاحب کے واسطے دوشالہ لے آؤ۔ سخت سرد ہوا چل رہی ہے۔“ بچارہ امین محمد حیران ہوا کہ دوشالہ کہاں سے لاؤں، خود میر صاحب کے گھر میں بھی کوئی زائد نہیں ہے۔ امین محمد صاحب باہر نکلے تو دیکھتے ہیں کہ ایک مرید دوشالہ لیے کھڑا ہے۔ اس نے کہا میں دیر سے انتظار میں کھڑا ہوں۔ یہ دوشالہ حضرت ماہ عالم کے لیے بطور نذر کے لایا ہوں۔ امین محمد صاحب نے وہ لے کر حضرت پر ڈال دیا۔ کچھ دنوں کے بعد لوگوں کو اصل حقیقت معلوم ہوئی اور لوگ اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ آپ کی سخاوت اور ایثار نفسی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس سبب سے گھر میں برتن اور کپڑے نہ رہنے پاتے تھے۔ ۱۴؍ ذی قعدہ کی آدھی رات کو ۱۰۰۳ھ میں انتقال فرمایا۔ گنبد شاہیہ کے متصل ایک الگ جگہ میں آپ کی قبر ہے۔ ”نور از جہاں رفت“ تاریخ وفات ہے۔ (تکملہ مرآۃ احمدی، ترجمہ مولانا ابوظفر ندوی۔ ص: ۵۸ و ۵۹)

شیخ عبدالعزیز اُجینی:

غوثی لکھتے ہیں کہ شیخ راجی محمد عینی اُجین کے بڑے خدارسیدہ بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے صاحبزادے شیخ عبدالکریم ان کے جانشیں ہوئے اور بڑی حد تک اپنے بزرگوں کی روش پر قائم رہے۔ ان کا انتقال ۱۰۰۵ھ میں ہوا۔ ان کے فرزند شیخ عبدالعزیز ہیں جو علوم متداولہ سے آراستہ ہیں۔ انھوں نے اوّلاً رسمی علوم کا اکتساب شیخ عبدالکریم نہروالہ کی خدمت میں کیا تھا۔ پھر بعد میں وجیہہ الملۃ والدین علوی احمد آبادی کے درس میں باالتزام بیٹھ کر کتب مبسوطہ کی تصحیح کی۔ آپ اس غرض سے کہ محتاجوں اور بے کسوں کی ضروریات بر لائیں بظاہر نواب کا منگار سپہ سالار

عبدالرحیم خانخاناں کی جاگیری ملک کی صدارت کا منصب اور نیز نواب صاحب کی مجلس کی مصاحبت قبول کر لی ہے مگر باطن میں سرِمو وابستگی خاطر کو پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ راقم (غوثی) زمانہ ہوش سے ان کے حالات کا محرم ہے۔ (اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار۔ ص: ۳۲۰)

محمد غوثی منڈوی صاحب گلزار ابرار:

'گلزار ابرار' کے مصنف محمد غوثی منڈوی کے حالات دوسرے مصنفوں نے بہت کم لکھے۔ خود انھوں نے اس کتاب کے آخر میں اپنے حالات اپنے قلم سے لکھے ہیں اور درمیان کتاب میں اپنے اساتذہ اور احباب کے تذکرہ کے ضمنی طور پر بھی اپنے متعلق کچھ باتیں لکھ دی ہیں۔ ان سب کی روشنی میں ان کے حالات یہ ہیں۔

محمد غوثی کے والد شیخ حسن بن موسیٰ احمد آبادی ہیں۔ جب ہمایوں نے گجرات پر حملہ کیا تو اس ہنگامے میں لشکر کے ہمراہ خاندیس سے چل کر مالوہ آئے۔ ایک موضع نونہرہ جو شہر مانڈو سے شمالی سمت میں تین کوس کے فاصلہ پر واقع ہے، اس میں آ کر قیام کیا۔ پھر وہاں سے طبیعت گھبرائی تو مانڈو میں رہنے لگے۔ محمد غوثی اسی شہر میں جمعرات کے روز گیارہویں رجب ۹۶۲ھ کو پیدا ہوئے۔ پانچ سال کے ہوئے تو شیخ کمال الدین قریشی کے مکتب میں داخل ہوئے۔ آٹھویں سال تجوید قرآن کی تکمیل کر کے فارسی پڑھی۔ گیارہ سال کے ہوئے تو ان کے والد نے انتقال فرمایا۔ ان کے والد کی دلی خواہش تھی کہ وہ زیور علم وفن سے آراستہ ہوں مگر ان کی ناگہانی موت نے آرزو پوری نہ ہونے دی۔ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے تحصیل علم کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ اسی اثناء میں ان کی والدہ نے شادی کے لیے اصرار کیا، چنانچہ سترہ سال کی عمر میں ازدواجی زندگی کا آغاز کیا۔ ازدواجی زندگی کے ساتھ بھی تعلیم کا شغل جاری رکھا۔ علم نحو اور ادب عربی کی کتابیں شیخ برہان الدین کالپوی سے پڑھیں۔ پھر کشف، المنار اور تلویح کا سید شاہ محمد سے درس لیا۔ پھر آگرہ کا سفر کیا اور پانچ سال وہاں مقیم رہے۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں گجرات کا سفر کیا اور حضرت شاہ وجیہہ الدین بن نصر اللہ علوی گجراتی سے اکثر درسی کتابیں پڑھیں۔ برہان پور میں حکیم عثمان بوبکانی سے علوم ریاضی حاصل کیے۔ پھر ۹۹۴ھ/ ۱۸۵۸ء میں واپس مانڈو آ گئے۔ سلسلۂ شطاریہ میں وہ شیخ صدر الدین محمد بزودوی اور شیخ محمد بن جلال گجراتی سے منسلک

تھے۔ جس وقت وہ احمد آباد میں آئے تو ان کی عمر ستائیس سال کی تھی۔ جب اکبری لشکر اور سلطان گجرات کے درمیان جنگ ہوئی تو وہ اس وقت احمد آباد میں موجود تھے۔ بیرم خانخاناں جب شہنشاہ اکبر کی جانب سے صوبہ گجرات کے گورنر بنائے گئے تو اس کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور کئی صفحات میں نثری قصیدہ لکھا ہے۔ پھر ایک مدت کے بعد جب اپنی کتاب 'گلزار ابرار' لکھی تو اس کا انتساب شہنشاہ نور الدین جہانگیر کے نام کیا۔ وہ اپنی کتاب کی تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں کہ ۱۰۰۳ھ میں اپنے استاد شاہ وجیہ الدین کے روضے کی زیارت کے لیے خاندیس سے احمد آباد گیا تھا تو وہاں شیخ اویس صاحبزادہ حضرت محمد غوث گوالیاری سے ملاقات ہوئی۔ 'گلزار ابرار' کی تالیف کا ارادہ ظاہر کیا اور شیخ سے دعا کی درخواست کی۔ شیخ نے فرمایا اگرچہ یہ منصوبہ دیر سے ظہور پذیر ہوگا لیکن بہت اچھا ہے۔ چنانچہ دس سال تک تیاری کی نوبت نہ آئی۔ آخر میں شیخ ابوالخیر مبارک خضر نے 'گلزار ابرار' کی تسوید پر باصرار آمادہ کیا۔ غوثی شیخ مبارک سے اُجین میں ملے تھے۔ والیٔ بدخشاں میر شاہرخ کی خدمت میں جاتے ہوئے اُجین میں رکے تھے۔ شیخ کی تحریک اور ہمت افزائی سے دو سال میں 'گلزار ابرار' کا مسودہ تیار ہوگیا۔ مگر اس کی تصحیح و تبییض میں پھر رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ بالآخر ماہ رجب ۱۰۳۲ھ میں مبیضہ تیار ہوگیا۔ بقول ان کے شیخ اویس کے ارشاد کے اٹھارہ سال بعد کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

'گلزار ابرار' ہند و پاک کے ۶۱۲ علماء و مشائخ کا ایک عمومی تذکرہ ہے جس میں اس وقت کے مروجہ سلاسل کے صوفیہ کے حالات لکھے گئے۔ یہ تذکرہ جہانگیر بادشاہ کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس کا نقشِ اوّل ۹۹۸ھ/ ۱۵۹۰ء میں تیار ہوا۔ پھر ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۲ء تک اس میں اصلاح و اضافہ ہوکر اس کی دوسری صورت تیار ہوئی لیکن اس کا زیادہ حصہ ۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء اور ۱۰۲۲ھ/ ۱۶۱۳ء کے درمیان لکھا گیا۔ اس تذکرہ کے مطالعہ کے بعد اس کی کئی خصوصیات سامنے آتی ہیں:

(۱) مصنف کو مؤرخین کی اس خامی کا پوری طرح احساس تھا کہ انھوں نے پاک و ہند کی مذہبی اور علمی سرگرمیوں کی اپنی کتابوں میں تفصیل نہیں لکھی۔ مصنف نے جب منہاج سراج جوزجانی کی طبقاتِ ناصری دیکھی تو معلوم ہوا کہ اس میں مذہبی اور علمی حالات سے کلیتہً اجتناب کیا گیا ہے۔ چنانچہ مصنفِ 'گلزار ابرار' نے منہاج سراج کے طرز پر

اظہار ناپسندیدگی کیا ہے۔

(۲) بعض مشائخ کے سنینِ وفات کے اندراج کا اہتمام کیا گیا ہے اور بے شمار غیر معروف علماء و مشائخ سے روشناس کروایا ہے۔

(۳) اس کی ایک اور قابلِ توجہ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جابجا گجرات کی تاریخ کے اہم واقعات کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ ایک مستقل عنوان ہے 'گجرات کی لڑائیاں'۔

(۴) اس کا باب چہارم، دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے مشائخ کے حالات اور پانچواں چمنِ سلسلۂ مشائخِ شطاریہ کے حالات میں نہایت ہی اہم ہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس تذکرے کی جان یہی دو ابواب ہیں جس میں اکثر مشائخ کے حالات کے باب میں مصنف خود عینی شاہد ہیں۔

(۵) حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات میں کئی ایسے نکات درج ہیں جن سے دیگر تذکرے خالی ہیں۔

(۶) بعض تذکرے محض متقدمین کی تحریروں کے بغیر کسی شعور و عقل کے نقلیات کے مجموعے بن کر رہ گئے ہیں۔ اخبار الاصفیاء، ثمرات القدس، کلمات الصادقین، مجمع الاولیاء وغیرہ کلی طور پر اخبار الاخیار مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے چربے معلوم ہوتے ہیں لیکن بعض تذکرہ نگاروں نے اخبار الاخیار پر مفید اضافے بھی کیے ہیں۔ ان میں 'گلزار ابرار' کا نام سرفہرست ہے۔

(ملخص از گلزار ابرار و مقدمہ محمد ارشد قریشی، اذکار ابرار، کرشن آباد، لاہور، مطبوعہ ۱۹۷۵ء)

حکیم روح اللہ بھڑوچی جہانگیری:

شیخ روح اللہ بن شیخ فقیہ اللہ انصاری شہر بھڑوچ کے باشندے، نسلاً انصاری اور مشرباً شطاری تھے۔ ان کے جد بزرگ آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے درمیان ملک عرب سے وارد ہند ہوئے اور گجرات کے مشہور بھڑوچ میں سکونت پذیر ہوئے۔ شیخ روح اللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے احمد آباد گئے اور وہاں علامہ شاہ وجیہ الدین علوی شطاری کے مدرسے میں داخل ہوئے اور علامہ کی خدمت میں ایک عرصے تک ظاہری

اور باطنی علم سے مستفیض ہوئے۔ اور آپ سے سلسلۂ شطاریہ میں بیعت وخلافت حاصل کی۔ بعد میں آپ نے حکیم ایرانی سے طب پڑھی۔ جب شیخ روح اللہ کی علمی قابلیت اور طبی مہارت زبان زد خلائق ہونے لگی تو آپ کی رسائی دربار اکبری کے امیر کبیر قلیج خاں (جو صوبہ گجرات کا نائب صوبہ دار ۹۹۵ھ میں ہوا تھا اور شاہزادہ دانیال کا خسر بھی تھا) تک رسائی حاصل کی اور حکیم صاحب شاہزادہ مذکور کے طبیب خاص مقرر ہوئے، جس کی بناء پر حکیم صاحب کو کئی بار شاہزادہ اور اس کے بھائی شاہزادہ مراد کے معالج رہنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس اثنا میں اکبری سپہ سالار عبدالرحیم خانخاناں کا شرفِ صحبت بھی ملا۔ اب آپ کا شمار بڑے عالموں اور طبیبوں میں ہونے لگا۔ انہی کے توسط سے آپ کی رسائی اکبر کے دربار میں ہوئی۔ اکبر نے آپ کو شاہی حکماء میں داخل کیا۔ شہنشاہ اکبر نے آپ کی غیر معمولی طبی قابلیت دیکھ کر فنِ طب میں صنعتِ توشیح کا التزام کرتے ہوئے ایک کتاب لکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ تین سال کی محنت سے آپ نے 'فوائدالانسان' نامی کتاب ۱۰۰۴ھ میں لکھ کر خدمت عالی میں پیش کی اور پھر موردِ عنایات شاہی ہوئے۔ اکبر کے بعد جہانگیر نے بھی حکیم روح اللہ کی علمی قابلیت کی وجہ سے اپنے شاہی حکماء میں تقرر فرمایا۔ مآثرِ رحیمی کا مصنف عبدالباقی نہاوندی ان کی علمی لیاقت اور خانخاناں کی صحبت کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح لکھتا ہے:

''بہ تحصیلِ علوم میل پیدا کرد بآن کہ در اہلِ علم و فضل نبود۔ ہمت بر تحصیلِ علوم گشت و در اندک زمان علم و تجربہ ایں فن رابدست در آورد۔ و امثال واقران در گذشت۔ والحق در تحریر میگویند کہ از منسوبان و تربیت یافتگان ایں سپہ سالار است۔''

حکیم روح اللہ کو کئی مواقع پر انعامات عطا کیے جانے کا ذکر 'مآثرِ رحیمی' اور 'تزکِ جہانگیری' میں اس طرح پایا جاتا ہے:

(۱) ۱۰۲۷ھ میں جبکہ خانخاناں برہانپور میں علیل ہوا تو حکیم روح اللہ کو علاج کے لیے گجرات سے بلوایا گیا۔ خانخاناں کے صحت یاب ہونے پر شاہ نے ان کو دو ہزار نقد اور ایک ہاتھی عطا فرمایا۔ (مآثرِ رحیمی، جلد سوم، ص: ۴۳)

(۲) اسی سنہ میں جہانگیر گجرات کے سفر میں تھا۔ آب و ہوا مزاج کے موافق نہ ہونے سے بخار کی شکایت پیدا ہوگئی۔ آپ نے علاج کیا۔ مزاج شناسی کے صلہ میں شاہ نے خوش ہوکر سومہر کلائی اور ایک ہزار نقد بطور انعام عطا کیا۔ (تزکِ جہانگیری، ص: ۲۳۲)

(۳) ملکہ نور جہاں بیگم پٹن کے قریب بیمار ہوئی۔ مشہور طبیبوں کو بلایا گیا لیکن کسی کے علاج سے فائدہ نہ ہوا۔ آخر میں حکیم روح اللہ طلب کیے گئے۔ ان کے علاج سے بیگم کو شفا ہوئی۔ شاہ نے خوش ہوکر ان کے وطن بھڑوچ میں تین مواضع بطور جاگیر مع اضافۂ منصب مرحمت فرمائے۔ اور حکیم موصوف کو چاندی میں وزن کرا کے اس قدر وزن کی چاندی ان کو بطور انعام مرحمت فرمائی۔ (تزکِ جہانگیری)

جہانگیر کے بعد شاہجہاں کے دور میں حکیم صاحب کی قدر و منزلت باقی رہی۔ ان کا زیادہ تر وقت احمد آباد و بھڑوچ میں گزرتا۔ نہایت ثروت و عزت کی زندگی گزار کر ۱۰۶۵ھ میں انتقال فرمایا اور بھڑوچ میں دفن کیے گئے۔

(ملخص از مضمون قاضی سید نورالدین شیرازی قاضی القضاۃ بھڑوچ، نوائے ادب سہ ماہی، بمبئی، ماہ اپریل و جولائی ۱۹۵۰ء)

شیخ احمد گجراتی:

ڈاکٹر جمیل جالبی 'تاریخ ادب اُردو' جلد اول میں لکھتے ہیں:

''محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی سے آٹھ سال پہلے ہی اکبر نے گجرات فتح کر لیا تھا اور وہاں کے اہل علم و ادب بڑی تعداد میں دکن کی ریاستوں میں چلے آئے تھے۔ گجرات سے گولکنڈا جانے والوں میں نمایاں نام شیخ احمد گجراتی کا ملتا ہے جس نے محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں دو مثنویاں پیش کیں۔ ایک 'لیلیٰ مجنوں' جس کے ۴۹ منتشر اوراق، جن میں تقریباً پانچ سو چالیس اشعار ہیں، پروفیسر محمود شیرانی کو دستیاب ہوئے تھے اور جواب تک احمد کے کلام کا واحد نمونہ تھے۔ اس مثنوی کا بقیہ حصہ ناپید ہے۔ دوسری مثنوی 'یوسف زلیخا' جو مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ تقریباً پونے چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور ہر طرح مکمل ہے۔ اس مثنوی سے نہ صرف شیخ احمد کے حالات، وطن، علمیت، تعلیم، خلافت اور فنِ شاعری پر روشنی پڑتی ہے بلکہ قدیم دور کا ایک پُرگو،

قادر الکلام شاعر بھی سامنے آتا ہے۔ شیخ احمد گجرات کا رہنے والا تھا جس کا ذکر اس نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں بھی کیا ہے۔

احمد دکھن کے خوباں ہوتیاں ہیں پُر ملاحت
تو توں دکھن کو اپنا گجرات کر کے سمجیا

جیسا کہ مثنوی 'یوسف زلیخا' سے معلوم ہوتا ہے محمد قلی نے اسے 'نوازشنامہ' نامی لکھ کر بلایا۔ اور احمد بھی بادشاہ کی سخن پروری اور دکھن کی آب و ہوا کی خوبی سن کر چلا آیا۔ اس کا پہلا سفر دکھن تھا۔ اس نے جیسا سنا تھا اسے ویسا ہی پایا۔ مثنوی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ وجیہہ الدین علوی کا مرید تھا اور خلافت بھی ان سے ملی تھی[1]۔

(1: روضۃ الاولیا، بیجاپور، صفحہ ۱۱۴ کے حاشیہ پر شاہ وجیہہ الدین علوی کے ۴۲ خلفاء کے نام درج ہیں جن میں ۳۱ واں نام شیخ احمد کا ہے۔)

'یوسف زلیخا' میں ۳۴ اشعار ان کی مدح میں لکھے گئے ہیں اور یہ دعائیہ اشعار اس طور پر لکھے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ وجیہہ الدین ابھی زندہ ہیں۔

الٰہی چھاؤں اس کی جم ٹھنڈی راکھ
جو ہیں اُس چھاؤں تل عالم سہس لاکھ

شاہ وجیہہ الدین علوی کا انتقال ۹۹۸ھ/ ۱۵۸۹ء میں ہوا۔ اور محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء میں تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ احمد نے اپنی مثنوی 'یوسف زلیخا' ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء اور ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۸ء کے درمیانی عرصے میں لکھی۔ اس اعتبار سے نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کے بعد یہ پہلی مثنوی ہے۔ عبدل کا 'ابراہیم نامہ' ۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء میں لکھا گیا۔ وجہی کی 'قطب مشتری' ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء کی تصنیف ہے۔

'یوسف زلیخا' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ احمد عربی و فارسی، تلنگی و سنسکرت سے بخوبی واقف تھا اور صَرف و نحو، علم بیان و معانی، علم کلام و الٰہیات، حکمت، فقہ اور طب پر پورا عبور رکھتا تھا۔ 'یوسف زلیخا' میں جہاں احمد نے اپنی شاعری، معنی آفرینی اور زورِ کلام کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ اگر میں شاعری میں زور و اثر دکھاؤں تو جاتی کے اشعار اس کے سامنے ست نظر آئیں۔

سو کچ باندھوں کوت زورات بل
جو ویسے ست اس کا نظم اس تل

وہاں اپنی شاعری کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ اپنی زبان (ہندوی) میں عربی و فارسی الفاظ کو کم سے کم ملاتا ہے۔

عرب الفاظ اس قصے میں کم لیاؤں
نہ عربی فارسی بھوتیک میلاؤں

یہ گجری اُردو کی بنیادی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے دیسی الفاظ کو کثرت سے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ سارے قدیم گجری شعراء اسی زبان و بیان کے ترجمان ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مثنوی گجری اُردو کے ترقی یافتہ زبان و بیان کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔ یہ رجحان قطب شاہی اسلوب سے مختلف تھا۔ جہاں شروع ہی سے فارسی اثرات اپنا رنگ جمائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فیروز، محمود اور ملا خیالی اسی اسلوب کے پیروکار ہیں اور خود محمد قلی قطب شاہ بھی فارسی زبان و بیان کے اثرات کو اپنی شاعری میں قبول کر رہا ہے۔

دراصل شیخ احمد کا یہ اسلوب بیجاپوری ادبی اسلوب سے قریب تھا جہاں کی زبان پر، اصناف سخن پر اور اوزان پر گجری زبان و بیان کے اثرات گہرے ہیں۔ میرانجی شمس العشاق، برہان الدین جانم، شیخ داول اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شاعری اسی رنگ و اثر کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس اثر نے بیجاپوری اسلوب کے رنگ کو اتنا بدلا کہ نصرتی تک فارسی اثرات کے بڑھ جانے کے باوجود، یہی رنگ و اثر قائم رہتا ہے۔ ملا وجہی کی 'قطب مشتری' میں اور قلی قطب شاہ کے کلیات میں فارسی اسلوب، اوزان، بحور، اصناف، تشبیہ و استعارہ، صنمیات و رمزیات اپنا رنگ جماتے نظر آتے ہیں۔ ایک ایسے ادبی ماحول میں جب شیخ احمد نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا لکھی اور اس میں عربی و فارسی الفاظ 'کم ملانے' کو وصفِ بیان جانا تو وہ اپنی ساری شاعرانہ خوبیوں کے باوجود گولکنڈا میں وہ مقبولیت و مرتبہ حاصل نہ کر سکا جو فارسی رنگِ سخن کی پیروی اُس دور کا جدید اسلوب تھا۔ اور احمد نے قدیم اسلوب میں طبع آزمائی کی تھی۔ اس لیے 'یوسف زلیخا' اور 'لیلیٰ مجنوں' جیسے کارنامے انجام دینے کے باوجود اس کی آواز آئندہ نسلوں تک نہ پہنچ سکی اور جیسے جیسے

جدید اسلوب کی خوشبو پھیلتی گئی، شیخ احمد کا نام بھی قابلِ ذکر شعراء کی فہرست سے خارج ہوتا گیا اور سوائے ابنِ نشاطی کی 'پھولبن' (۱۰۶۶ھ/ ۱۶۵۵ء) کے اس شعر کے۔

نہیں اس وقت وہ شیخ احمد
سخن کا دیکھتے باندھیا سو میں سد

اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔''

(تاریخِ ادبِ اُردو، جلد اول، مصنفہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۲۲۲ تا ۲۲۳)

تصنیفات

حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کا مستقل مشغلہ درس و تدریس اور اپنے مریدوں کی روحانی تربیت تھا لیکن پھر بھی جب موقع ملتا تو تصنیفی شغل بھی اختیار کر لیتے اور اس میں بھی ان کا مقصد طلبہ کے لیے سہولت بہم پہنچانا اور مشکل مسائل کا حل ہوتا۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

''دائم بدرسِ علومِ دینی اشغال داشت وقدرتِ او در جمیع علومِ عقلی و نقلی بمرتبہ بود کہ کم کتاب درس از صرف ہوائی تا قانون وشفا وشرح مفتاح وعضدی باشد کہ او شرح یا حاشیہ براں ننوشتہ وخلائق را پیوستہ از انفاسِ متبرکہ اوفیض می رسید''[1]

(وہ ہمیشہ علومِ دینی کے درس میں مشغول رہتے تھے۔ تمام علومِ عقلی و نقلی پر عبور اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ صرف ہوائی سے قانون و شفا و شرح مفتاح اور عضدی تک شاید ہی کوئی کتاب ہو جس پر انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو۔ لوگ ہمیشہ ان کی ذاتِ بابرکات سے فیض حاصل کرتے رہتے تھے۔)

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ آپ کی جملہ تصنیفات کی تعداد تقریباً تین سو ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد تو ضائع ہو چکی ہے اور دستبردِ زمانہ سے جو رہ گئی ہیں وہ بھی مخطوطات کی شکل

[1] منتخب التواریخ، ص: ۵۰۔

میں ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے مختلف فنون کی درسی کتابوں میں سے پچیس کتابوں پر آپ کے حواشی وتعلیقات کی فہرست دی ہے۔ اس میں سے بعض حواشی کی ان کے عہد کے بعد بھی بڑی اہمیت رہی۔ طلبہ انھیں نہ صرف دلچسپی سے پڑھتے بلکہ اس کی نقل کا اہتمام بھی کرتے تھے۔

آپ کے درسی کتابوں کے شروح وحواشی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت مجمل ہوتے ہیں جس میں ابہام بالکل نہیں ہوتا۔ آج کل کے عربی مدارس کے لحاظ سے اس زمانے کے استعداد و ذہنی بلند تھے۔ ان کے لیے نہ بہت زیادہ وضاحت کی ضرورت تھی اور نہ لمبی چوڑی تشریح کی۔ صرف مشکلات ومغلقات کی گرہ کشائی تھی اور ان شروح وحواشی سے ان کا مقصود حاصل ہوجاتا تھا۔ آپ نے ایسے انداز سے مشکل مقامات کی وضاحت کی ہے جس سے اصل مطالب کے سمجھنے میں بالکل دشواری نہیں ہوتی۔

اس زمانے میں بھی بعض لوگوں نے آپ کی کتابوں پر اعتراضات کیے لیکن جب انھوں نے ذرا تامل کے ساتھ غور کیا تو اصل حقیقت ان پر ظاہر ہوگئی۔ غوثی نے 'گلزار ابرار' میں شیخ عثمان بن شاہ جھجن سارنگ پوری مالوی سے روایت نقل کی ہے کہ ایک روز شیخ منور بن شیخ عبدالحمید لاہوری نے بیان کیا کہ وجیہ الملت کے حاشیے دور اندیش اور بلند نظر نکتہ سنجوں کی نظر میں کمالِ علمیت کا کوئی رنگ نہیں رکھتے ہیں۔ راوی نے جواب دیا کہ بزرگوار محشّی کا انداز تعلیقات کے لکھنے میں اس طرف ہمت کا صرف کرنا نہیں ہے کہ دقت اور عمیق نظری سے کوئی کام لے کر سخن کا پایہ اونچا کیا جاوے۔ بلکہ آپ کی طبیعت اور ہمت کو جو منظور ہے وہ یہ بات ہے کہ جب عبارت کی دشواری شرحوں اور متنوں کے اندر طالب کی نظر میں مراد کے چہرے پر نقاب ہوجائے تو آپ آسان تحریر اور سہل ترکیب کے ساتھ وہ نقاب طلبہ کی نظر کے سامنے سے اُٹھا دیں۔ حالانکہ یہ جواب موافقِ واقعہ ہے لیکن معترض نے اس کو سست توجیہہ سمجھا۔ اتفاقاً چند روز بعد درس کے وقت 'مختصر عضدی' کی شرح میں ایک عبارت پر نظر پڑی کہ اس کی گرہ کشائی کی طاقت شیخ منور نے اپنے اندیشے میں بلکہ کسی حاشیہ نویس کے حل میں نہیں پائی۔ ناچار وجیہ الملت کے حاشیے کی طرف استمداد کا رُخ کیا۔ تھوڑی توجیہہ سے وہ عقدہ حل ہوگیا[1]

---

[1] اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار، ص: ۴۰۸۔

بہر حال آپ کی تصنیفات جو مخطوطات کی شکل میں دستیاب ہیں اور احمد آباد، حیدر آباد، لکھنؤ، رامپور، علی گڑھ اور بمبئی کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان کا ہم تعارف پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب 'حقیقتِ محمدیہ' نام کی جو مستقل تصنیف ہے، زیور طباعت سے آراستہ ہوکر مع اُردو ترجمہ سرشیخ روضہ کمیٹی، احمد آباد کی جانب سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوگئی ہے۔ اس لیے پہلے ہم سرفہرست اسی کو رکھتے ہیں۔

(۱) حقیقتِ محمدیہ:

یہ کتاب صوفیہ اور متکلمین کے درمیان ایک بڑے اہم موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے لیے شاہ صاحب نے دو مطالب کے عنوان دیے ہیں۔ مطلب اوّل میں ذاتِ بحت کے تصور کو واضح کیا ہے اور پھر ان مراتب کا ذکر کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی تجلی ظاہر ہوئی۔ تعینات اور تقیدات کا سلسلہ ظہور پذیر ہوا اور وحدت اپنی وحدانیت قائم رکھتے ہوئے کثرت کی طرف متوجہ ہوئی۔ مطلب ثانی میں اہلِ سنت وجماعت کے متصوفانہ اور متکلمین کے مذاہب میں تطبیق و توافق کی راہ اختیار کی ہے۔ متکلمین ومتصوفہ کے نزدیک عالم کے ظہور کی ترتیب ایک ہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ صفتِ علم پر متکلمین کی ترتیب منتہی ہوجاتی ہے اور صوفیہ ایک قدم اور بڑھا کر صفتِ علم کو وجودِ خاص کا ظہور تسلیم کرتے ہیں۔ وحدت الوجود سے متصوفہ کی مراد عالم کی ظہور کی یہ ترتیب ہے کہ عالم ظہور ہے صُوَرِ علمیہ کا، اور علم ظہور ہے وجودِ خاص کا۔ لہٰذا عالم، وجودِ خاص کا ظہور ہوا۔ مطلب ثانی کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ کی صفات کے اپنے تعلقات ہوتے ہیں۔ ان تعلقات پر حدوث وامکان مرتب ہوتے ہیں جن کا ترتب نفسِ صفت پر ممکن نہیں۔ ان تعلقات سے نفسِ صفت میں کوئی تغیر واقع ہوتا ہے نہ تجزی۔

اس مختصری کتاب میں شاہ صاحب کی دقت نظری اور ان کی نکتہ رسی قدم قدم پر ظاہر ہوتی ہے۔ کتاب کیا ہے دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ اپنے مرید سیّد احمد دکنی کے کسی سوال کے جواب میں آپ نے اس کتاب کا تکملہ بھی لکھا۔ تکملہ میں اولیاء اللہ کے اقسام وانواع سے بحث کی ہے۔ ان میں سے مختلف انبیاء علیہم السلام کے قلوب پر بارہ اقطاب بتائے ہیں۔ فلسفیانہ اور متصوفانہ مباحث آیاتِ قرآن اور احادیثِ رسولؐ کی روشنی میں پیش کیے ہیں جس سے اس

کتاب کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ کتاب دقیق اور مشکل موضوع سے تعلق رکھتی ہے اس لیے جب تک علوم معقول ومنقول پر گہری نظر نہ ہو اس سے کماحقہٗ استفادہ ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی آپ کے عزیز شاگرد اور مرید عبدالعزیز خالدی نے اس کی شرح فارسی میں لکھی۔ 'حقیقتِ محمدیہ' کا اُردو ترجمہ مع متن کے محمد زبیر غلام نبی قریشی لیکچرار ایچ کے آرٹس کالج احمد آباد نے شائع کر دیا ہے۔ جس کو اس موضوع سے دلچسپی ہو اس کے مطالعے سے اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ شاہ وجیہ الدین کی 'حقیقتِ محمدیہ' کی شرح شیخ عبدالعزیز دہلوی نے لکھی۔

(۲) شرح جام جہاں نما (فارسی):

جام جہاں نما تصوف میں مشہور متن ہے۔ اس کے مصنف محمد بن عزالدین بن عادل بن یوسف مغربی مشہور بہ سیرین ہیں۔ ۸۵۰ھ کی تصنیف ہے۔ عام صوفیوں میں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی مختلف شرحیں لکھی گئیں۔ شاہ صاحب نے ایک شرح تحریر فرمائی ہے۔ اس کے دو نسخے کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں موجود ہیں۔ پہلا نسخہ کتابی صورت میں ۱۲/۸ تقطیع پر ہے۔ سرخ جدول سے محدود ہے۔ جہاں متن اصل عبارت ہے وہاں سرخ خط کشیدہ ہے۔ یہ کتاب مختلف اہلِ علم کے ہاتھوں میں رہی ہے کیونکہ مختلف اشخاص کے حواشی موجود ہیں۔ سب سے زیادہ حاشیہ احمد بن سلیمان کا ہے جو اس عصر کے مشہور علماء میں سے ہیں۔ اس کی تصحیح اور بعض حواشی ملا علی پرو (مخدوم علی مہائمی) کے ہیں۔ اگرچہ یہ نسخہ کامل ہے مگر آخری اوراق کرم خوردہ ہونے سے معلوم نہ ہو سکا کہ کس سنہ کا ہے اور کس نے لکھا ہے۔ خط صاف، خوشخط اور نسخ میں ہے۔ حاشیہ پر ملا احمد بن سلیمان کا جو خط ہے اس سے بہت مشابہ ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ملا احمد کا لکھا ہو۔

دوسرا نسخہ ۱۵/۸ تقطیع پر ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے بطور مسودہ نقل کیا ہے۔ یہ بھی کامل نسخہ ہے اور جگہ جگہ سے تصحیح شدہ ہے۔ اسی کتاب کے قلمی نسخے مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور آصفیہ حیدر آباد میں بھی ہیں۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اس کا موضوع علم التوحید ہے اور اس کے ابواب کی تقسیم مندرجہ ذیل طریقے سے کی گئی ہے: دائرہ اوّل اور دائرہ دوم۔ ہر دائرہ میں دو قوس اور ایک خط ہے۔ دائرہ اوّل میں مندرجہ ذیل مضامین ہیں: احدیت،

واحدیت، وحدت، اعتبار، وجود، علم، شہود، نور، تعین یا تجلی اوّل۔

دائرہ دوم کے مضامین حسب ذیل ہیں: ظاہر وجود (باصطلاح فلاسفہ واجب الوجود)، ظاہر علم (باصطلاح فلسفی ممکن الوجود)، برزخیت (باصطلاح مذکور حقیقت انسانی یا روح) تعین یا تجلی ثانی۔

اس کتاب کے مضامین اور اس کے غوامض سے آگاہی کے لیے اس فن سے آگاہی ضروری ہے۔ پھر بھی ہم اس کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے کسی کے لیے دلچسپی کا باعث ہو اور وہ شاہ صاحب کی دقیق النظری کا اندازہ کر سکے۔ مثلاً ایک مقام میں متن کی عبارت یہ ہے:

> "وافعال کہ شامل ظاہر وجود است، کہ وجوب وصف خاص اوست، و
> شامل علم ظاہر است کہ امکان از لوازم اوست، وشامل حقیقت انسان است کہ
> برزخ است، بین الامکان والوجوب۔"

اس عبارت کی تشریح میں جناب شاہ صاحب نے انسان کو خلیفۂ الٰہی بہت مختصر اور جامع طریقے سے ثابت کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ خیال رہے کہ صوفیوں کے نزدیک وجودِ مطلق کا نام حق ہے اور اسی کو حقیقت الحقائق اور احدیت بھی کہتے ہیں۔ وجودِ مطلق جب تنزلات کے مرتبے میں آئے تو اس کو 'ظہور' کہا جاتا ہے اور یہ ظہورات تعینِ ذاتی کے اعتبار سے 'شئون' کہلاتے ہیں جو بے حساب اور بے شمار ہیں۔ اسی کو قرآن پاک نے یوں ادا کیا ہے "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ" اور شئون کی مثال محسوسات کے ذریعے ٹھیک تخم شجر کی ہے جس میں عظیم الشان شجر بننے کی قابلیت موجود ہے۔ اور حقیقت وجود بہ شرط شئے جو اسماء وصفات ہیں ان کو 'مرتبۂ واحدیت والوہیت' کہتے ہیں۔ اور حقیقت وجود بہ شرط لا شئے کا نام 'احدیت' رکھتے ہیں۔ اور حقیقت وجود نہ بشرط شئے اور نہ بشرط لا شئے ہو ایسی مساوی الطرفین ذات کو باصطلاح صوفیہ 'تجلی اوّل یا تعین اوّل' کہتے ہیں۔ اور فلاسفہ 'علم یا عقل اوّل' اور یہ تجلی اول جب کسی تعین جزئی کے ساتھ مخصوص ہو تو اس کو صفت کہتے ہیں۔ عام اس سے کہ یہ صفت وجودی ہو جیسے علیم، قدیم وغیرہ یا سلبی ہو جیسے قدوس، سلام وغیرہ۔ پھر تجلی اوّل نے بہ تعین مخصوص علیم، مرید، قدرت، بصیر، سمیع، متکلم، حیّ کی صورت اختیار کی تو ان صفاتِ سبعہ کو 'ائمہ صفات' کہتے ہیں۔ پس وجود مطلق جب ان ائمہ صفات

کے ساتھ تنزلات کا مرتبہ اختیار کرے تو پانچ مرتبوں کا ظہور ہوتا ہے:

(۱) مرتبۂ واحدیت، (۲) مرتبہ ارواح مرجدہ (یا عالم جبروت)، (۳) دس نفوسِ عالمہ (جیسے عالم مثال)، (۴) مرتبہ شہادت وحس (جیسے عالم ملک)، (۵) مرتکبہ کون جامع یعنی انسان کامل جو مکمل مجموعِ تنزلات ہے۔

اس قدر سمجھ لینے کے بعد اب جناب شاہ صاحب کی تشریح ملاحظہ ہو۔ ''وحدت، کثرت، وجوب وغیرہ کی مختصر بحث کے بعد تیسرے جملے کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ ان صوفیوں کے نزدیک مرتبہ وجوب وجود، اسمائے الٰہی کلی سے مراد ہے جو ۲۸ ہیں جیسے بدیع، باعث وغیرہ۔ اور امکان وجود سے مراد 'اسماء کونی' ہیں اور وہ ۲۸ ہیں جیسے عقلِ کل، طبیعتِ کل وغیرہ۔ اور وجوب و امکان کے درمیان جو مرتبہ وسط ہے اس کو 'برزخ' کہتے ہیں۔ اور یہی حقیقتِ انسان ہے۔ کیونکہ انسان تمام حقائق ملک وملکوت وجبروت کو شامل ہے اور چونکہ انسان اس حیثیت سے کہ وہ کامل تمام مراتب الٰہی اور جامع تمام تنزلات کونی کا ہے اسی سبب سے وہ نائب اور خلیفۃ اللہ ہے اور یہی معنی خلافتِ الٰہی کے ہیں۔''

اسی طرح آگے چل کر صفحہ ۹ پر حقیقتِ محمدیہ بیان فرماتے ہوئے ''فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ'' کی جو تشریح قوسِ احدیت اور قوسِ واحدیت کے ضمن میں کی ہے وہ بے انتہا لطیف ہے اور اہلِ ذوق کے لیے باعثِ حظ۔

(۳) حاشیہ علی التلویح:

''تلویح توضیح'' علامہ سعد الدین تفتازانی (م ۷۹۳ھ) کی اصولِ فقہ میں مشہور درسی کتاب ہے۔ مختلف علماء نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس کی شرح اور حواشی لکھے ہیں۔ شاہ وجیہ الدین صاحب نے بھی ایک حاشیہ لکھا ہے۔ کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں قلمی نسخہ مصنف کے خود نوشتہ سے منقول ہے اور حاشیہ پر ہر جگہ تصحیح کی گئی ہے۔ یہ کتاب ابتدا سے آخر تک خط نسخ میں ہے۔ ۱۰/۱۴ تقطیع ہے۔ تصنیف سے تقریباً سو سو برس بعد ۱۱۲۰ھ میں اس کی کتابت ہوئی ہے۔ اس کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم رب یسر و تمم بالخیر. الحمد للہ رب

العالمین، و الصلوۃ و السلام علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین''

اور اختتامی جملہ یہ ہے:

''ھذا آخر الکتاب بعون الملک الوھاب و الحمد للہ علی اتمامہ انہ ولی التوفیق و بیدہ ازمۃ التحقیق.''

جہاں جہاں اصل کتاب کا حوالہ ہے وہاں سرخی سے 'قولہٗ' لکھ دیا ہے۔ مختلف مقامات کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ تشریح کرتے وقت طلبہ کے ذہن نشین کرانے کی بے حد کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً حقیقت ومجاز کی بحث میں ایک جگہ صاحبِ تلویح نے لکھا ہے ''ففیہ نظر'' اس نظر کے پیچیدہ مطالب کو جناب شاہ صاحب نے ''حاصل النظر'' کے عنوان سے بہت سہل عبارت میں تحریر فرمایا ہے تا کہ طالب کے دماغ پر زیادہ بار نہ پڑے۔ پھر اس نظر کا جو جواب دیا جاتا ہے اس کو تحریر فرما کر ''حاصل الجواب'' کے عنوان سے اس کی تشریح فرماتے ہیں۔ سیّد شریف جرجانی کا اس پر اعتراض نقل کر کے پھر خود اپنا جواب تحریر فرماتے ہیں۔ اس مثال سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جناب شاہ صاحب کا اس طرزِ تحریر سے اصل منشاء کیا ہے اور کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں ہے۔ (۱۷/۱۲) اور ایک جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ محمدیہ میں ہے۔

(۴) حاشیہ علی المواقف:

اس مشہور کلامی کتاب کے مصنف قاضی عضد الدین عبد الرحمٰن ہیں جس کی شرح علامہ سیّد شریف علی بن محمد جرجانی (م ۸۱۶ھ) نے کی ہے۔ پھر بہت سے علماء نے اس پر حواشی لکھے۔ ہند و پاک میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے حاشیہ کی بڑی شہرت ہے۔ شاہ وجیہ الدین علوی کا حاشیہ اس کے پہلے کا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں موجود ہے لیکن آخر سے ناقص ہے اور بڑا حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ ۱۰/۱۴ رائج تقطیع پر معمولی خط نسخ میں ہے۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے: ''بسم اللہ الرحمن و بہ نستعین رب وفقت فتمم. الحمد للہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہ محمد و الہ و اصحابہ

اجمعین. سبحان جماله عن سمة الحدوث.''

اورآخری فقرہ یہ ہے: ''و ذالک لاعتبارہ یعنی ان الاحوال یتکلف.'' یہ غیر مختتم جملہ نصف صفحہ پر ختم ہوگیا ہے جس سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ کتاب اسی قدر اصل نسخہ سے نقل کی گئی ہے یا بقیہ اجزاء ضائع ہوگئے ہیں۔

یہ کتاب علم کلام کی معرکۃ الآراء کتابوں میں شمار کی جاتی ہے اور اس کے لیے متعدد شرحیں اور حواشی لکھے گئے۔ لیکن شاہ صاحب کے اس حاشیہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہر جگہ حاصل الکلام اور حاصل الجواب وغیرہ کے عنوان سے مطالب کی تشریح کی ہے اور ہر پیچیدہ عبارت کو آسان اور سہل طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جہاں کہیں ذات واجب الوجود کے متعلق کوئی تذکرہ آجاتا ہے تو الفاظ شاندار اور معانی خیال بہت بلند ہوجاتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا ذوق وشوق رہبری کررہا ہے۔ مثلاً کتاب کی ابتدا میں ہے ''سبحان جماله عن سمة الحدوث و تنزهت سرّ اوقات جماله عن وصمة التغير و الانتقال.'' اس نسخہ میں نہ کاتب کا نام ہے اور نہ سنہ کتابت ہی درج ہے۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ کب کی تحریر ہے۔

(۵) رسالہ النسکریہ

اس رسالے کا پورا نام 'النسکزية فی اَجوبَةِ الطفقريه مولانا علی قوشجی بحث ما انا قلث فی المطول' ہے جو صرف ۲۵/اوراق پر مشتمل ہے۔ تقطیع ۱۲/۸ پر ہے۔ معانی و بیان پر 'تلخیص المفتاح' جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن قزوینی (م ۷۳۹ھ) کی ایک مشہور کتاب ہے۔ مولانا علی قوشجی نے ''بحث ما انا قلث'' پر چند اعتراض کیے تھے۔ یہ رسالہ ان کے جواب میں ہے۔ میر ہاشم صاحب جو خود بھی بڑے عالم تھے، انھوں نے بھی اس مبحث پر ایک رسالہ لکھا ہے۔ اس کتاب پر جابجا ان کے حاشیے بھی ہیں۔ کاتب کا نام محمد یوسف ہے۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے: ''بسم الله الرحمن الرحيم . قال صاحب الايضاح و يقدم المسند ليعيد التقديم تخصيصه بالخبر الفعلی'' اور اختتام ان جملوں پر ہے: ''هذا ما تيسر لی هو الميسر لكل عسير و ما توفيقی الا بالله، عليه توكلت و

اليه أنيب.''

یہ رسالہ ۹ مبحث پر منقسم ہے جن میں سے بعض بہت ہی مختصر اور بعض طویل ہیں۔ طرز تحریر یہ ہے کہ پہلے نفس تلخیص کے اصل مسئلے کو لکھا ہے۔ پھر سیّد شریف جرجانی کا اعتراض نقل کرکے علامہ قوشجی کا نظریہ بیان فرمایا ہے اور آخر میں شاہ صاحب نے اپنا جواب تحریر کیا ہے۔ جہاں علامہ قوشجی کا اعتراض شروع ہوا ہے وہاں سرخی سے ''قولهٗ'' ہے اور جس جگہ سے جواب دیا ہے اس کی ابتدا ''اقول'' سے ہوتی ہے۔ اس مبحث پر تین اور رسالے اسی کے ساتھ مجلد ہیں۔ رسالہ مولانا علی قوشجی، رسالہ ملا عبدالغفور، رسالہ میر ہاشم۔ مگر افسوس ہے کہ ان میں سے کسی پر سنہ تحریر نہیں ہے اور بدقسمتی سے یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ اس رسالے کا نام 'النسکریہ' کیوں رکھا اور کس مناسبت سے؟ شاہ صاحب کا ایک دوسرا رسالہ 'انکریہ' ہے جو غالباً انکار سے ہے۔ جس میں ایک کفر کے فتوے کی تردید کی ہے۔ ممکن ہے کاتب نے اسی لفظ کو 'النسکریہ' سے تبدیل کردیا ہو۔

(۶) حاشیہ علی مختصر المعانی:

علامہ سعد الدین تفتازانی نے مختلف فنون کی بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور یہ خصوصیت آپ ہی کو حاصل ہے کہ آپ کی تصانیف میں پانچ کتابیں تہذیب المنطق، مختصر المعانی، مطول، شرح عقائد اور تلویح آج تک داخلِ درس ہیں۔

نصاب میں مطول و مختصر دونوں کتابوں کا اضافہ شیخ عبداللہ و شیخ عزیزاللہ کے ذریعے سے عہد سکندر لودھی یعنی نویں صدی کے آخری سے ہوا ہے۔ شاہ وجیہ الدین صاحب نے مطول اور مختصر دونوں پر حواشی لکھے۔ زیرنظر کتاب کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں قلمی موجود ہے۔ تقطیع ۷/۱۱ پر ہے۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے: ''بسم الله الرحمن الرحيم. قولهٗ اداء الحق شئی ثما يجب عليه'' اور اختتام یوں ہے: ''قوله كانهٗ قنا ابن الهجا القنا جمع قناة و هی الرمح، و الفليق الجيش قد وقع من تحشية سلطان المحققين، افضل المدققين، اشرف المتورعين ملجاء السالكين الشيخ وجيه الحق و الدين.'' کاتب کا نام نہیں ہے۔ تاریخ بھی نہیں ہے۔ فقط اس قدر لکھا ہے کہ ''فی شهر رمضان سنة من الهجرية النبوية''۔ چونکہ مختصر المعانی تلخیص المفتاح کی شرح ہے اور عموماً

متوسط درجے کے طلبہ اس کو پڑھتے ہیں اس لیے اس حاشیے میں طلبہ کے لیے سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ معانی کا بیان، مغلق الفاظ کی تشریح، مطالب کی توضیح کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات بھی صاف معلوم ہوتی ہے کہ دسویں اور گیارہویں صدی کا طریقۂ تعلیم کیا تھا۔ اس عہد میں نفسِ فن پر بہت کم لوگ توجہ کیا کرتے تھے۔ متون کی شرحیں، شرحوں کے حواشی اور حواشی پر حاشیہ اس عہد کا بہترین کارنامہ ہے۔ متن پر اعتراض، شرح پر اعتراض اور اس کا جواب، پھر اس جواب پر اعتراض اور اس کا جواب، کہیں "فَفِيْهِ نَظَرٌ"، کسی جگہ "فَتَامَّلْ" کی تشریح کو اصل کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ زمانہ کے اثر سے جناب شاہ صاحب بھی بہت متاثر نظر آتے ہیں اور جگہ جگہ اس کو کھول کر طلبہ کے فہم کے مطابق بیان فرماتے ہیں۔ قطب الدین رازی، سعد الدین تفتازانی، میر سیّد شریف جرجانی نے جو روش اختیار کی، مابعد کے تمام علماءِ متاخرین قدم بہ قدم اس کی پیروی کرتے آئے۔

(۷) رشاد شرح الارشاد:

نحو میں الارشاد نام ایک کتاب قاضی شہاب الدین زآولی دولت آبادی کی ۸۶۰ھ کی تصنیف ہے۔ شاہ صاحب کے زمانے میں داخلِ درس تھی اس لیے شاہ صاحب نے اس کی شرح لکھی ہے اور اس کا نام 'رشاد' رکھا ہے۔ مشہور ہے کہ جناب شاہ صاحب کی پہلی تفصیل ہے[1]۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رامپور کی رضا لائبریری میں ہے اور ایک نسخہ کتب خانہ محمدیہ جامع مسجد، بمبئی میں۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے: "بسم الله الرحمن الحمد لله و سلام علی عباده الذين اصطفٰى خصوصاً علی سيّدنا محمد المصطفٰى الحمد هو الوصف...."

آخری حصہ ناقص ہے۔ شاہ صاحب کی شرح یعنی 'رشاد' پر ملک احمد بن ملک پیر محمد کا حاشیہ متوسط تقطیع پر ۱۹۰ صفحے کا ہے۔

(۸) حاشيه علی العضدی:

یہ کتاب ۱۳/۸ تقطیع پر خط نسخ میں ہے۔ صفحات ۱۳ ہیں۔ اس کی ابتدا "بسم اللّٰہ

[1] مجموعہ حالات شاہ وجیہ الدین علوی، مصنفہ عبد المنعم باعکظ۔

الرحمن الرحيم و به نستعين الحمد لله رب العالمين و الصلوة و علی رسوله سيّدنا الخلق و الانبياء و المرسلين. قوله و بهذا الاعتبار يندرج فی الادلة السمعية..." سے ہوتی ہے۔ اور اختتام ان فقروں پر ہے: "فيرجع الظن لا التصديق بانّ هذا احده لا ان نفس الحد ظنی، ثم تمت."

درگاہ پیر محمد شاہ کے کتب خانہ میں زیرِ نظر قلمی نسخہ ۱۰۱۰ھ کا لکھا ہوا ہے یعنی شاہ صاحب کی وفات کے ۱۲ سال بعد کا ہے۔ کاتب کا نام 'کبیر محمد بن شاہ محمد' ہے لیکن کتاب کے اندر خط دو قسم کے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل کتاب سے کچھ ضائع ہو جانے کے بعد دوبارہ تحریر کرایا گیا ہے۔ ابتدا میں اور چند دوسری جگہوں میں خوشخط ہے اور آخری صفحات میں معمولی۔ اور یہی معمولی کبیر محمد صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ سطریں عموماً ۲۰ اور ۲۲ ہیں۔ کاغذ باریک، چکنا اور احمد آبادی ہے۔ 'عضدیہ' چند صفحے کا ایک چھوٹا سا رسالہ فنِ مناظرہ میں ہے جس کے مصنف عضد الدین احمد ایجی (م ۷۵۶ھ) ہیں۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ متعدد علماء نے اس کی شرحیں لکھیں۔ بعد کے علماء نے پھر ان پر حواشی کا اضافہ کیا۔

(۹) شرح نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر:

اصولِ حدیث میں "نخبۃ الفکر فی مصطلح اھل الاثر" مشہور محدث حافظ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی مکی (م ۸۵۲ھ) کی مایۂ ناز تصنیف ہے۔ اپنے فن میں نہایت جامع اور عمدہ کتاب ہے۔ متن صغیر الحجم ہونے کے باوجود کثیر النفع ہے۔ اور مصنف کے زمانے سے لے کر زمانۂ موجودہ تک داخلِ درس ہے۔ مصنف نے نزھۃ النظر کے نام سے خود اس کی شرح لکھی۔ پھر اس کے بعد شاہ وجیہ الدین صاحب نے توجہ فرمائی اور اس شرح کی شرح لکھی۔ زیرِ تبصرہ کتاب کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ میں موجود ہے۔ متوسط تقطیع، خط نسخ، بدخط، صفحات ۷۸، فی صفحہ ۱۸ سطریں، کاغذ احمد آبادی۔ ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:

"بسم الله، و به نستعين، الحمد لله حمدًا يوافی نعمه...."

اور اور اس کے آخر میں ہے: "ان الذی ترد روايته، من انكر متواترًا من اشرع معلومًا من الدين." یہ کتاب آخر سے ناقص ہے۔ تقریباً نصف اوراق مفقود ہیں۔ اس کتاب

کا دوسرا قلمی نسخہ رامپور کی رضا لائبریری میں ہے۔

(۱۰) حاشیہ شرح وقایہ :

شارح وقایہ کا نام عبید اللہ اور والد کا نام مسعود ہے۔ آپ کا لقب صدر الشریعہ اور دادا کا نام محمود اور لقب تاج الشریعہ ہے۔ آپ نے اپنے دادا تاج الشریعت کی مشہور فقہی کتاب 'وقایہ' کی نہایت عمدہ شرح لکھی جو نہایت مقبول ہوئی اور آج تک داخلِ درس ہے۔ شرح وقایہ کی بھی بے شمار شرحیں اور حاشیے لکھے گئے۔ ان میں سے ایک شاہ وجیہہ الدین صاحب کا بھی حاشیہ ہے۔ اس کا جو قلمی نسخہ کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ میں موجود ہے، متوسط تقطیع، ۲۷۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ خط نسخ واضح، فی صفحہ ۲۱ سطریں، کاغذ مہرہ کشیدہ احمد آبادی، ناقص از اول پانچ ورق و ناقص از آخر۔ ابتدا میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

''لا یزید علی تصریحه و فی التصریح لا عموم'' اور اس کے آخر میں ہے:

''فهو شریک للاثنین ای اشرک آخر معهما جملة واحدة یعنی باب الوصیّة'' پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ملک احمد کا حاشیہ بھی ہے۔ متن کو 'قولہ' سے تعبیر کیا ہے جو سرخی سے ہے۔ اس حاشیہ میں بھی شاہ صاحب نے صرف شاگردوں کی رعایت کی ہے۔ نہ تو کاتب کا نام ہے نہ سنہ کتابت۔ ملک احمد کے دستخط سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قبضے میں یہ کتاب رہ چکی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رامپور میں بھی ہے۔

(۱۱) حاشیہ علی شرح الجامی :

شرح جامی درس کی مشہور کتاب ہے۔ اس کے مصنف عبد الرحمٰن نور الدین جامی ہیں۔ آپ فارسی کے مشہور شاعر اور صوفی بزرگ ہیں۔ آپ نے عربی اور فارسی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کی تعداد ۵۴ تک پہنچتی ہے۔ شرح جامی نحو کی مشہور کتاب 'کافیہ' کی سب سے زیادہ مشہور اور متداول شرح ہے جس کا اصل نام 'الفوائد الضیائیۂ' ہے کیونکہ یہ صاحبزادہ ضیاء الدین یوسف کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس میں گو نحوی مباحث کو عقلیت کا رنگ دیا گیا ہے تاہم ٹھوس استعداد پیدا کرنے کے لیے بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس کتاب کی بھی بہت سی شرحیں اور حاشیے

لکھے گئے جن میں ایک شاہ وجیہہ الدین صاحب کا بھی ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے رضا لائبریری، آصفیہ حیدرآباد، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور بمبئی یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ جس میں سے احمد آباد اور حیدرآباد کے نسخے ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ آصفیہ حیدرآباد کا نسخہ ۱۰۵۶ھ میں لکھا گیا ہے اور بمبئی کا ۱۰۸۱ھ میں۔ آخر الذکر کے کاتب محمد عنایت اللہ بن عبد العزیز و عبد اللطیف ہیں۔ ابتدا میں ایک صفحہ کا مقدمہ ہے اور پھر اصل کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے:

''قوله الحمد لولیه و الصلوة علی نبیه. اختلف عباراتهم فی تعریف الحمد، فقال بعضهم هو الثناء بالجمیل علی وجه العظیم و قال بعضهم هو الوصف بالجمیل علی جهة التعظیم و قال بعضهم هو اظهار الکمال و یعلم من جمیع ذالک ان الحمد مصدر معروف هو فعل الحامد و کذالک لفظ الحدیث شعر بذالک و هو 'کل امر ذی بال لم یبدأ بحمد الله فهو اقطع'. و اما کون الحمد مصدرًا مجهولًا فهو لا یکون معنی مغایرًا للمصدر المعروف اذ لا فرق بین ان یقال حمدت زیدًا و حمد زید فلا بلائم ابدًا و وجه آخر لا یقال المراد بکون المصدر مجهولًا کونه محمودًا لانا نقول یا باء لفظ الحدیث لا یلائم.''

حیدرآباد کا نسخہ متوسط تقطیع پر ۲۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نسخ میں نہایت صاف اور خوش خط ہے۔

(۱۲) وافیہ شرح کافیہ :

طلبہ کی عربی تعلیم کے لیے نحو کے بنیادی مسائل بیان کرنے میں ابن حاجب کی کتاب کافیہ کی خاص شہرت ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ابتدا ہی سے وہ داخلِ درس رہی۔ چونکہ نحو کی بڑی کتابوں میں مسائلِ نحویہ اور قواعدِ نحویہ میں بڑا اختلاف رہا اس لیے ان مسائل سے قطع نظر کر کے اس میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے اور انہی باتوں کو لکھا گیا جو طلبہ کے لیے نہایت ضروری تھیں۔ اس لیے اس کے متعلق یہ مصرعہ مشہور ہو گیا: ع: کافیہ کافیست باقی در دست۔

اس کتاب کی بھی بے شمار شرحیں اور حاشیے لکھے گئے جن میں شاہ وجیہہ الدین کی ایک

شرح وافیہ کے نام سے ہے۔ اس کا ایک نسخہ قاضی نور الدین صاحب بھڑوچ کے کتب خانہ میں ہے۔ یہ نسخہ ابتداء وسط سے ناقص ہے۔ تقطیع متوسط اور کرم خوردہ ہے۔ اس کے آخر میں لکھا ہے:

"کاتبه و مالکه حامد بن شاه وجیه الدین"۔

مولانا سیّد ابوظفر ندوی مرحوم نے حضرت شاہ وجیہ الدین علوی پر ایک مضمون ماہ فروری ۱۹۳۳ء میں لکھا تھا جس میں شاہ صاحب کی قلمی کتابوں کا تعارف بھی کرایا تھا۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے ماہ اپریل ۱۱۳۳ء کے معارف میں لکھا کہ مولانا سیّد ابوظفر ندوی نے شاہ صاحب کی تصنیفات کے متعلق یہ لکھا تھا کہ "شاید ہی کوئی ان میں سے طبع ہوئی ہو۔" مولانا عبد العزیز صاحب میمن پروفیسر عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اطلاع دیتے ہیں کہ "کم از کم ان کی ایک کتاب 'مختصر کافیہ' ایسی ہے جو کسی زمانے میں بمبئی میں چھپی تھی۔ اور وہاں کے کتاب خانوں میں اب بھی ملے گی۔" لیکن باوجود تلاشِ بسیار کے اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہوا۔

(۱۳) شرح شواهد المنهل والوجیز (مصنفہ محمد بن ابوبکر بن عمر مخزومی و مامینی (۸۲۸ھ) :

یہ بھی عربی نحو وصرف کی کتاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ محمدیہ جامع مسجد بمبئی میں ہے لیکن بالکل ناقص ہے۔ ابتدائی صفحات غائب ہیں۔ اس کتاب کے پہلے صفحے پر 'حواشی علی منهل الصافی بشرح الوافی فی النحو' لکھا ہے۔ اس کا جو نسخہ مولانا ابوظفر ندوی صاحب کو پٹن کے مشہور خاندان جمال الدین قطب و محمد سعید قطب کے ذاتی کتب خانہ میں ملا ہے، اس کی ابتدا میں ہے: "بسم الله الرحمن . قوله موردها و مصدرها..." اور اس کے آخر میں ہے: "و لیس هذا یفید للجمع و انما هو بیان لا اطلاق ای اطلاق الجمع." کل صفحے ۹ ہیں۔ خط نسخ تقطیع ۷/۱۲، فی صفحہ ۷ اسطریں ہیں۔

(۱۴) رسالہ ترتیب ارکان الصلوٰۃ :

چند اوراق عربی زبان میں ہیں۔ کتاب کا منشا نام سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب بمبئی یونیورسٹی میں کھٹ کھٹے کلیکشن میں ہے۔ اس کا ایک نسخہ بھڑوچ میں قاضی نور الدین صاحب کے کتب خانہ میں بھی ہے مگر آخر سے ناقص ہے۔

(۱۵) شرح البسیط : (مصنفہ نجم الدین شریحی الکبراوی)

میت کا ترکہ وارثوں میں کس طرح تقسیم کیا جائے کہ ہر وارث کے پاس ترکہ کی وہ مقدار پہنچ جائے جس کا وہ مستحق ہے۔ یہ علم بڑا مبسوط ہے اور فرائض کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس علم میں ترکہ کی مقدار اور اس کی تقسیم کے مسائل سے اور شرعی طور سے مستحقین میں تقسیم کرنے سے بحث کی جاتی ہے۔ اس فن پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور سراجی ہے۔ ایک کتاب بسیط بھی ہے۔ اسی بسیط کے مسائل کو نہایت وضاحت کے ساتھ شاہ وجیہ الدین صاحب نے لکھا ہے۔ خوش قسمتی سے اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ محمدیہ جامع مسجد میں مکمل حالت میں موجود ہے۔ چوب قلم اور خط نستعلیق ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے: "بسم الله الرحمن الرحیم، الحمد لله رب العالمین ، و الصلوة علی الافضل من بعده محمد و آله و صحبه اجمعین. اله افتتح الکتاب...."

آخر کے الفاظ یہ ہیں: "قد وقع الفراغ من تحریر شرط البسیط لمولانا سلطان العارفین برهان الموحدین حجة العاشقین شاه وجیه الحق و الملة و الدین قدس سره العزیز."

کہیں کہیں حاشیہ عبد الرحیم کا ہے۔ تقطیع ۱۳/۱۸۔ اس کے دو نسخے رامپور کی رضا لائبریری میں بھی ہیں۔ ایک خط نسخ میں اور ایک نستعلیق میں۔

(۱۶) شرح کلید مخازن :

مبدا و معاد کے متعلق شاہ محمد غوث گوالیاری کا یہ عجیب و غریب رسالہ ہے۔ اس میں علوی وسفلی اشیا کی حقیقتیں، توحیدِ صوفیہ کے مشرب اور کشفی تحقیق کے اصول بتائے گئے ہیں۔ اور اربابِ فنا و بقا کے لیے عینی و علمی موجودات کی شناخت، کشف و معائنہ کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے۔ اس رسالے کی کئی شرحیں لکھی گئیں۔ اس میں سے ایک شرح شاہ وجیہ الدین کی بھی ہے۔ جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں موجود ہے۔

(۱۷) حاشیہ تفسیرِ بیضاوی:

یہ مشہور تفسیر ہے۔ اس کا اصلی نام 'انوار التنزیل واسرار التاویل' ہے۔ اس کے مصنف قاضی ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ بن قاضی امام الدین ابوالقاسم عمر بن قاضی القضاۃ فخر الدین بن محمد بن علی بیضاوی (متوفی ۷۱۹ھ) ہیں۔ بیضاوی کی یہ تفسیر حقائق کلام وحکمت، دقائق حدیث و سنت، اسرارِ معانی و بیان، رموزِ فلسفہ و میزان، وجوہِ قرأت وتفسیرِ آیات، منقول ومعقول تاویلات، غوامضِ صرف ونحو، مباحثِ لغات، محاسنِ نظم، مقاصدِ تنزیل ...غرض صدہا علوم و معارف کا خزینہ ہے۔

اس تفسیر پر پچاسوں حواشی وتعلیقات تحریر ہوئے جس میں سے ایک شاہ وجیہہ الدین علوی کے قلم سے بھی ہے۔ اس حاشیہ کا مقصد بھی وہی ہے جو اور لوگوں کے پیش نظر رہا ہے۔ یعنی بیضاوی کی مشکلات کو حل کرنا اور مسائل کو زیادہ آسان انداز میں ذہن نشین کرانا۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب نے خاصی کوشش کی ہے۔ بیضاوی کی عبارت کو 'قولہٗ' کے بعد لکھتے ہیں۔ اس بعد اس کی تشریح کرتے ہیں۔ عبارت کہیں بھی الجھنے نہیں پائی ہے۔ جتنی بھی عبارتیں ہیں صاف اور سیدھی ہیں۔ جہاں پر ضرورت ہے قواعدِ نحویہ سے بھی بحث کی ہے۔ زمخشری، علامہ تفتازانی اور جوہری کے حوالے موجود ہیں۔ اس دور کی دوسری شرحوں کے مقابلے میں ان کی شرح زیادہ بہتر ہے اور اس سے مفہوم کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ اس میں دوراز کار بحثوں سے گریز کیا گیا ہے۔ اس لیے طلبہ کے لیے بہت زیادہ قابلِ استفادہ ہے۔

شاہ وجیہہ الدین کے حاشیہ بیضاوی کے چار قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ ایک علی گڑھ میں حبیب گنج کلیکشن میں ہے جس کے اوراق ۱۸۷، سطریں ۲۲ اور ۲۳ ہیں۔ خط نستعلیق ہے۔ اختتام کے الفاظ کاتب نے یوں لکھے ہیں: ''تمام شد حاشیہ میاں وجیہہ الدین بر تفسیر بیضاوی، بتاریخ ۲۲؍شہر ذی الحجہ روز دوشنبہ ۱۰۷۸ ہجری در احمد آباد گجرات۔'' ابتدا اس طرح سے ہوتی ہے: ''بسم الله الرحمن و ما توفیقی الا بالله علیه توکلت و الیه انیب.'' دوسرا نسخہ حیدرآباد میں آصفیہ لائبریری میں ہے۔ صفحات ۵۸۱۔ اس نسخے میں کاتب نے خاتمے پر یہ عبارت لکھی ہے: ''هذه الحاشیة المبارکة لسیّد العلماء و الفضلاء و افضل

الشرفاء المستقیم علی الصراط النبوی الشیخ وجیه الدین المعروف بالعلوی اسکنه الله بحبوبة الجنان و افاض الله علیه شآبیب الغفران علی التفسیر البیضاوی وقت الضحوة من الاثنین المسلوک فی شهر الشوال المعظم.'' یہ نسخہ مکمل ہے۔

تیسرا نسخہ حیدرآباد میں سالار جنگ میوزیم کی لائبریری میں صفحات ۴۶۸ پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ ۱۰۴۸ھ کا ہے۔ کاتب نے آخر میں یہ عبارت لکھی ہے۔ یہ نسخہ بھی مکمل ہے:

''تمت تمام شد۔ کاتب حروف عبدالرحمٰن بن میاں صدیق، شہر ذوالقعد تاریخ ثمانیہ و عشرون (۲۸ ذی قعدہ) سنہ ثمانیہ واربعین والف (۱۰۴۸ھ)''

چوتھا نسخہ کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں ہے۔ اس نسخے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ خود شاہ صاحب کے دست مبارک کا ہے۔ چنانچہ اس کے آخر میں ہے:

''کتب الحواشی املی علینا علی التفسیر البیضاوی المولی المحقق ... مظهر الملة و الدین محمد الگاذرونی. اضعف العباد وجیه الدین بن نصر الله بن عماد الدین العلوی و کان الاتمام بدار السلطنة احمدآباد وقت الاشراق.''

جس سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب اپنے استاد ابوالفضل مظہر الدین گاذرونی کے دورانِ درس میں استاد کی تشریحات وتقریروں کو نوٹ کرتے گئے تھے اور یہ حاشیہ استاد وشاگرد دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

یہ حاشیہ بے حد مقبول ہوا۔ دسویں اور گیارہویں صدی میں عرب وشام میں عام طور پر زیرِ درس تھا اور اس کی بہت سی نقلیں کی گئیں۔

(۱۸) الرسالۃ العلویۃ:

یہ رسالہ چار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں 'کشاف' کی ''فمن ثقلت موازینه'' کی تفسیر کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ رامپور کی رضا لائبریری میں موجود ہے۔ ابتدا میں ایک نوٹ ہے جس میں لکھا ہے کہ: ''یہ رسالہ حضرت شیخ وجیہہ الدین کی تصنیف ہے جو صاحب کشاف کے اس قول کی تردید میں لکھا گیا ہے جو اس نے ''فمن ثقلت موازینه'' کے بارے میں کہا ہے۔''

اس رسالے کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے: "بسم اللہ الرحمن الرحیم و به نستعین ، الحمد لله علی احسانه و الصلوة علی محمد افضل خلقه..."

اس رسالے کے کاتب ملک احمد ہیں جیسا کہ خاتمے کی عبارت سے پتہ چلتا ہے:

"تمت الرسالة العلوية ضحوة يوم الاحد (بروز اتوار) ۲/ محرم الحرام ۱۰۷۳ ھ علی ید الفقیر ملک احمد منقولة بخط المؤلف قدس سره."

☆☆☆

منتشر تصنیفی اوراق

شاہ وجیہ الدین علوی کی ان کتابوں کے علاوہ اور بھی بعض تصانیف اور شروح وحواشی کا پتہ چلتا ہے جو ناقص اور منتشر طور پر پائے جاتے ہیں۔ مولانا سیّد ابوظفر ندوی مرحوم نے اپنے مقالہ مندرجہ رسالہ 'معارف' ۱۹۳۳ء میں ان کی نشان دہی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ایک اور چھوٹا سا رسالہ ۲/۱۰ تقطیع کا میری نظر سے گزرا۔ اس میں کل بیس صفحے ہیں۔ جناب سیّد محمد غوث گوالیاری پر جو اعتراضات کیے گئے تھے اس کے جواب میں ہے۔ اس کے علاوہ اور چند منتشر اوراق بھی ملے ہیں جن میں سے بعض شرح ملا کا حاشیہ ہے۔ کچھ اوراق پر شرح وقایہ کا حاشیہ ہے۔ شرح ہدایت الحکمة پر جو حاشیہ تھا کچھ حصہ اس کا بھی موجود ہے۔ فنِ عروض پر کوئی کتاب تھی۔ چند اوراق اس کے بھی محفوظ رہ گئے ہیں۔ ایک مجموعہ فنِ منطق میں ہے اور دوسرا نحو میں۔ بعض خطوط بھی ہیں لیکن سب نامکمل۔ چند دیگر رسائل بھی قابلِ ذکر ہیں[1]۔"

گم شدہ کتابیں:

شاہ صاحب کے شروح وحواشی میں سے جو اپنے دور میں متداول اور رائج تھے بہت سوں کا اب پتہ نہیں چلتا۔ مولانا سیّد عبدالحئی صاحب 'الثقافة الاسلامية فى الهند' میں لکھتے ہیں

[1] رسالہ معارف، اعظم گڑھ، فروری ۱۹۳۳ء۔

کہ "مولانا عبدالرحمٰن جامی کی 'لوائح' جو فنِ تصوف کی مشہور کتاب ہے، اس کی شرح مولانا وجیہہ الدین صاحب نے بھی لکھی تھی[1]۔"

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب 'تذکرہ' میں لکھتے ہیں کہ: "اسی عہد میں 'اصولِ بزودی' عام طور پر داخلِ درس تھی، اسی لیے متعدد علماءِ ہند نے اس کی شرحیں اور حاشیے لکھے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے بحث امر تک شرح لکھی تھی جس کو شیخ عیسیٰ جونپوری نے پورا کیا۔ مولانا جمال الدین نے بھی شرح لکھی۔ مولانا منور الدین کے قلم سے لکھی ہوئی میرے پاس موجود ہے۔ شیخ وجیہہ الدین گجراتی کی شرح بھی عرصے تک دیارِ دکن و گجرات میں متداول رہی[2]۔"

ان کے علاوہ ان کی جن کتابوں کا ذکر مستند مصنفوں نے اپنی کتابوں میں خصوصیت سے کیا ہے ان میں چند بڑے اہم تھیں لیکن اب ان کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ ان کے نام یہ ہیں:

(۱) حاشیہ ہدایہ فقہ میں۔ (۲) حاشیہ شرح تجرید و اصفہانی، محقق دوانی کے قدیم حاشیہ پر حاشیہ، علم کلام میں۔ (۳) حاشیہ قطبی شرح شمسیہ فن منطق میں۔ (۴) حاشیہ شرح حکمة العین مرگ چنگی فن حکمت میں۔ (۵) حاشیہ مطول علم معانی میں۔ (۶) حاشیہ شرح تفتازانی عقائد میں۔

[1] اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، ص: ۲۶۳۔
[2] تذکرہ، ص: ۳۰۴۔

ملفوظات

صوفیائے کرام نہ صرف حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق کے پیکر تھے بلکہ ان کی بابرکت صحبتوں میں جو بھی کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتا وہ اپنے اندر نمایاں تبدیلی محسوس کرنے لگتا۔ ان کی خانقاہیں اعمالِ صالحہ کے مراکز اور ان کی مجلسیں تزکیۂ نفس کی بہترین تربیت گاہیں تھیں۔ ان کی گفتگو میں جو دل آویزی اور روحانی کشش ہوتی تھی اس کی بنا پر عامی سے لے کر عالم تک ان کی خدمت میں جانا باعثِ برکت و سعادت سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی زبان مبارک سے جو کلمے بھی نکل جاتے انھیں ان کے عقیدت مند قلمبند کر لیتے تھے اور یہی کلماتِ شریفہ ان کے ملفوظات کہلانے لگے۔

ہندوستان میں ملفوظات جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے فارسی کے مشہور شاعر امیر حسن علاء سنجریؒ کے دل میں آیا۔ وہ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے چہیتے مرید اور ان کی پاکیزہ مجلس کے حاضر باش صاحبِ قلم تھے۔ حضرت محبوبِ الٰہی جب اپنے مریدین اور حاضرینِ مجلس سے مخاطب ہوتے تو ان کا ایک ایک بول دل میں اُتر جاتا تھا۔ ان کی دلکش اور دلآویز گفتگو کو وہ قلمبند کر لیتے۔ ۷۰۷ھ / ۱۳۰۷ء میں انھوں نے انھیں 'فوائد الفواد' کے نام سے ترتیب دینا شروع کیا اور ۷۲۱ھ میں جب وہ اس کی ترتیب سے فارغ ہوئے تو گویا علم تصوف میں ایک نئے عنوان کا اضافہ ہو گیا تھا۔ امیر حسن نے نہ صرف ملفوظات نویسی کی داغ بیل ڈالی بلکہ اس کو

تصوف کی تحریک کی نشر و اشاعت کا ایک مؤثر ذریعہ بنا دیا۔

امیر حسن کے اس کامیاب تجربے نے دوسرے معاصرین کو اس طرف متوجہ کیا اور اوچہ (سندھ) سے لے کر مَنیر (بہار) تک ملفوظات کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خود حضرت نظام الدین اولیاء کے مریدوں میں خواجہ محمد بن مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے 'انوار المجالس'، خواجہ عزیز الدین صوفی نے 'تحفۃ الابرار و کرامۃ الاخیار' اور مولانا علی جاندار نے 'دُررِ نظامیہ' لکھ کر اس فن کو آگے بڑھایا۔ راجپوتانہ میں شیخ حمید الدین صوفی ناگوریؒ خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے ایک پوتے نے 'سرور الصدور فی نور البدور' میں اپنے دادا کے حالات اور ملفوظات جمع کیے۔ دکن میں حضرت برہان الدین غریبؒ کے مریدوں میں سے عماد الدین کاشانی نے 'نفائس الانفاس' اور مولانا رکن الدین نے 'احسن الاقوال' کے نام سے گرانقدر ملفوظات ترتیب دیے۔ حضرت سیّد زین الدین داؤد شیرازیؒ کے مرید سیّد حسین نے 'ہدایت القلوب' مرتب کی۔ سندھ میں سہروردی سلسلہ کے بزرگ سیّد جلال الدین بخاری المعروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے تین ملفوظات 'جامع العلوم'، 'سراج الہدایت' اور 'مناقب مخدوم' ترتیب دیے گئے۔ خواجہ کرک سہروردیؒ کے ملفوظات 'اسرار المخدومین' کے نام سے لکھے گئے۔ گجرات میں شیخ احمد کھٹوؒ کے ایک مرید محمود ایرجی نے 'تحفۃ المجالس' مرتب کی۔ بہار میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ملفوظات 'معدن المعانی' ترتیب پائے۔

مذکورہ بالا ملفوظات کے علاوہ 'خیر المجالس' ملفوظات خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ مرتبہ حمید قلندر، جوامع الکلم ملفوظات خواجہ سیّد محمد حسینی گیسو درازؒ مرتبہ سیّد محمد اکبر حسینی، انوار العیون فی اسرار المکنون ملفوظات شیخ احمد عبد الحق ردولویؒ مرتبہ شیخ عبد القدوس، ملفوظات شیخ سلیم چشتی مرتبہ ابراہیم معصوم، لطائف قدوسی ملفوظات شیخ عبد القدوس گنگوہی مرتبہ رکن الدین دہلوی، احسن الشمائل ملفوظات حضرت نظام الدین اورنگ آبادی مرتبہ خواجہ کامگار خاں، فخر الطالبین ملفوظات شاہ فخر الدین دہلوی مرتبہ نور الدین حسینی، نافع السالکین ملفوظات خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی مرتبہ مولانا امام الدین وغیرہ چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کے وہ ملفوظات ہیں جو محققین کے نزدیک مستند اور قابلِ اعتماد ہیں اور ہماری تاریخ کے بڑے قیمت تاریخی ماخذ ہیں۔ بادشاہوں کے درباری

مؤرخین نے جن واقعات کو سیاسی مصلحت یا ذاتی اغراض کی خاطر نظر انداز کر دیا ہے، یہ درویش اپنی مجلسوں میں ان ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑ کر گئے ہیں اور اپنے عہد کے مذہبی رجحانات، تمدنی احوال اور معاشرتی پہلو کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں:

''قرونِ وسطیٰ کے بیشتر ہندی مؤرخین ایرانی نظریۂ تاریخ سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تاریخوں میں صرف بادشاہوں کے حالات اور جنگی مہموں کی تفصیل ملتی ہے۔ عوام کی زندگی اور ان کے مسائل کی کہیں کوئی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ملفوظات ہمارے تاریخی مآخذ کی اس تکلیف دہ کمی کو ایک حد تک پورا کر دیتے ہیں۔ ان میں عوام کے دلی جذبات، ان کی پوشیدہ آرزوئیں، کشمکش حیات میں ان کی ہار جیت، ان کی مایوسیاں اور پریشانیاں، ان کی معصوم مسرتیں، سب ہی محفوظ ہوگئی ہیں۔''

(نذرِ عرشی دہلی، ۱۹۶۶، ص:۳۳۶)

ہندوستان کے جلیل القدر مشائخ میں حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کی ذاتِ بابرکات نے جو پائیدار نقوش چھوڑے ہیں وہ تاریخ تصوف میں یادگار رہیں گے۔ وہ صرف درسیات کے میدان میں معلم و معربی نہ تھے بلکہ روحانیات میں بھی اپنا نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان کے اوقات کا اگر ایک حصہ تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے میں صرف ہوتا تو کچھ وقت اپنے مریدوں کی اصلاح اور ان کے دردِ دل کے علاج میں گزرتا تھا۔ ان کی روحانی تربیت کا اہتمام کرتے، ان کی صحبت میں آ کر لوگ اپنے باطنی اور روحانی امراض کی دوا کرتے۔ ان کی بابرکت مجلس میں دنیا کے مختلف موضوعات پر تبصرہ ہوتا۔ اپنے ماحول اور گزرے ہوئے عہد کی خوبیوں اور برائیوں پر گفتگو ہوتی۔ رنج و غم کی داستانیں سنائی جاتیں۔ باطنی احوال و کیفیات اور وارداتِ دل کا اظہار ہوتا۔ ذکر و اذکار، ریاضت و عبادت، مدارج سلوک اور اوراد و وظائف کے متعلق ہدایات طلب کی جاتیں۔ شاہ صاحب کی کارآمد باتوں اور ان کی بروقت ہدایتوں کو ان کے مریدوں نے بھی قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کے ملفوظات کا ایک مجموعہ 'بحر الحقائق' کے نام سے

ترتیب دیا گیا۔[1] اس کے علاوہ دیگر مجموعے ملفوظات کے نام سے مرتب ہوئے۔ ان میں سے ایک مجموعہ شاہ صاحب کے ایک مرید محمد احمد نے مرتب کیا۔ یہ غالباً وہی بزرگ ہیں جو احمد دکھنی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اس کا ایک خطی نسخہ شیخ بہادر ولد دولت خاں لاہوری کا لکھا ہوا مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں دستیاب ہوا ہے جس کا سنہ کتابت ۱۰۹۴ھ ہے۔[2] اس مجموعہ ملفوظات کے علاوہ 'احوال شاہ وجیہ الدین مصنفہ عبد المنعم باعلظ' اور 'گلزار وجیہہ گجراتی مصنفہ حافظ اسماعیل گودی' میں بھی شاہ صاحب کے کلمات اور اقوال زریں نقل کیے گئے ہیں جو غالباً ان کے کسی اور مجموعہ ملفوظات سے ماخوذ ہیں۔ ہم ان میں سے کچھ ملفوظات کے ٹکڑے خاص ترتیب کے ساتھ مختلف عنوانات کے تحت پیش کرتے ہیں تاکہ شاہ صاحب کے ارشاد و ہدایت اور ان کی روحانی تعلیمات کے گوشے سے زیادہ اُجاگر ہو کر قارئین کے سامنے آجائیں۔

(۱: اس کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے، جس کا سنہ کتابت ۱۲۹۸ھ ہے۔ ۲: مخطوطہ حبیب گنج کلیکشن، خط نستعلیق، ورق ۱۴، سطر ۱۵، سائز "5.5 × "8.2 ہے۔ اس کا ایک نسخہ پروفیسر خلیق احمد نظام کے پاس ہے۔ موصوف انڈیا آفس لندن سے اس کا فوٹو لائے ہیں اور وہ اس نسخے سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے جو نسخے کراچی اور پشاور یونیورسٹی میں ہیں، ہمارے نسخے سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں اور ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔)

درس و تدریس کے ساتھ باطنی کیفیت:

''پرسیدند کہ حضرت در حال پیری تدریس جمیع علوم میں فرمایند تشویش خود نمی شود؟ فرمودند: بحکم ''وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ'' ہیچ کس را جواب نمی توانم داد۔''

لوگوں نے پوچھا کہ حضرت ضعیفی کی حالت میں تمام علوم کا درس دیتے ہیں، پریشانی تو نہیں ہوتی؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ سائل کو مت جھڑکو، اس بنا پر کسی طالب علم کو جواب انکار میں نہیں دے سکتا۔

''و پرسیدند کہ حضرت ظاہر بافادۂ علوم رسمی مشغول بودند در احوال باطن خود ہیچ تفاوت می یابند یا نہ؟ فرمودند کہ یک لحہ تفاوت شود بلائی ما ہم درس نگوید۔ زبان با خلق در گفت است و دل جائی دگر دارم۔ بیت:

از دروں شو آشنا وز بروں بیگانہ باش
ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں''

لوگوں نے پوچھا کہ حضرت ظاہری علوم رسمی کے فائدہ دینے میں مشغول ہیں تو ایسی صورت میں باطنی احوال میں کچھ تفاوت پاتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر ایک لحہ بھی تفاوت محسوس ہو تو پھر ہماری بلا ہی درس دے۔ زبان اگرچہ لوگوں سے گفتگو میں مشغول رہتی ہے لیکن میرا دل اور ہی جگہ رہتا ہے۔ اس پر شعر پڑھا: اندر کا واقف کار بن اور باہر سے اپنے کو اجنبی رکھ۔ ایسی عمدہ روش دنیا میں کم ہوتی ہے۔

علم اور شغل :

''می فرمودند کہ طالب را باید کہ شغل ہم بکند و علم نیز بخواند۔ ہر چہ غالب آید سالک را میسر یابد۔''

فرماتے تھے کہ طالب کو چاہیے کہ شغل (مراقبہ) بھی کرے اور علم بھی پڑھے۔ اس میں سے جو بھی غالب آجائے گا سالک کو منزلِ مقصود پر پہنچائے گا۔

شغل کی اہمیت :

''شیخ احمد دکھنی گفت کہ در ذکرِ الٰہی لذتے بیشتر یافتہ می شود از شغل۔ فرمودند ایں اسم ذات را بہ تصور توحید چرا کنند۔ گفت طریق آن از حضرت بیاموزم۔ سر مبارک نگوں کردہ فرمودند کہ خود را اللہ اللہ گوید پرسید کہ اعلیٰ و اخوف از اعمال چیست۔ فرمودند کہ شغل کند و در ہماں باشد۔''

شیخ احمد دکھنی نے کہا کہ ذکرِ الٰہی میں زیادہ لذت حاصل ہوتی ہے یا شغل میں؟ آپ نے فرمایا کہ اسم ذات کو تصورِ توحید کے ساتھ کیوں نہ کرے، تو انھوں نے کہا کہ یہ طریقہ تو میں حضرت سے سیکھوں گا۔ شاہ صاحب نے سر مبارک جھکا کر فرمایا کہ اللہ اللہ کہتا رہے۔ پوچھا کہ تمام عملوں میں اعلیٰ اور سب سے خوفِ الٰہی پیدا کرنے والا کون سا ہے؟ فرمایا شغل (مراقبہ) کرے اور اسی میں رہے۔

''چوں طالب شغل گرفتہ در خلوت نشست ہمہ آمد۔ یعنی مہلکات کہ اخلاقِ ذمیمہ است از ہمہ خلاص شد و منجیات کہ اخلاق حمیدہ است حاصل شد۔''

جب طالب شغل اختیار کر کے خلوت میں بیٹھے گا تو سب کچھ اسے ملے گا یعنی برے اخلاق جو تباہ کن ہیں اُن سے رہائی پائے گا اور عمدہ اخلاق جو نجات و کامرانی کا موجب ہیں اس کے اندر پیدا ہو جائیں گے۔

''و می فرمودند کہ آں قدر وقت کسیکہ در تحصیلِ علم صرف می کند آنرا نیز اگر در شغل صرف نماید موجب زیادتِ ترقی است۔''

اور فرماتے تھے کہ جتنا وقت آدمی تحصیلِ علم میں لگاتا ہے اگر اتنا ہی شغل میں صرف کرے تو زیادہ ترقی کا سبب ہوگا۔

''گفتم در ذکر اللہ لذت بیشتر یافتہ می شود از شغل۔ فرمودند ہمیں اللہ اللہ بہ تصورِ توحید چرا نکنید۔''

(جامع ملفوظات کہتے ہیں) میں نے کہا کہ ذکر الٰہی میں بہ نسبت شغل کے زیادہ لذت پائی جاتی ہے۔ تو فرمایا کہ اللہ اللہ تصورِ توحید کے ساتھ کیوں نہیں کرتے۔

تصورِ رسولؐ :

''می فرمودند کہ اگر در ہر روز یک ساعت یا دو ساعت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم را تصور کند درویش صفائی بے غایت قربِ آن سرور نیز محصل و میسر گرد۔''

اور فرماتے تھے کہ اگر ہر روز ایک گھڑی یا دو گھڑی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور کرے تو اس کے دل میں نہایت صفائی پیدا ہوگی اور آنحضرتؐ کی نزدیکی بھی حاصل ہوگی۔

وسوسہ کا علاج :

''شخصے از وسواس شکایت کرد۔ فرمودند کہ شما پاسِ انفاس کن۔ نفس در کار خود باشد شما در کار خود باشید۔''

کسی نے نفس کے وسوسوں کی شکایت کی۔ فرمایا نفس پر ہمیشہ نظر رکھو۔ نفس کا کام ہی وسوسے ڈالنا ہے مگر تمھارا کام یہ ہے کہ ہر دم نفس کا لحاظ رکھو۔ نفس اپنے کام میں لگا رہے اور تم اپنے کام میں لگے رہو۔

''شخصے گفت کہ خطرات فاسدہ در مشغولی بسیار پیدا می شوند۔ فرمودند کہ ذکر جہر بکنید و فرمودند کہ شغل اسم ذات اگر بر فلک زر تصور کند بصورت شمس ظاہر خواہد شد۔ و اگر برنگ نقرہ تصور کند بصورتِ قمر ظاہر کردہ۔ و در اوائل نقش ثابت نمی شود۔ بعد از انکہ ثابت شد در دل چراغ مستدیری گردد۔ از اں پس در دل ستارہ استظہار می باید و قمر ظہوری گردد۔ و گویا روشنائی آن بر آسماں می افتد و اشیاء آن عالم بہ آں روشنائی می بینند و دراں قمر صورت طبعی یا قمر حقیقت محمدی است۔''

کسی نے کہا کہ مشغولی (مراقبے) کی حالت میں بہت سے فاسد خطرے پیدا ہوتے ہیں تو بتایا کہ اس صورت میں بلند آواز سے ذکر کیا کرو۔ اگر اسم ذات کا دھیان آسمان پر سونے کے تصور کے ساتھ کرے تو اسے وہ سورج کی شکل دکھائی دے گا۔ اگر چاندی کے رنگ کے ساتھ تصور کرے تو چاند دکھائی دے گا۔ ابتدائی حالت میں نقش پائیدار نہیں ہوتے۔ پھر اس کے بعد دل کے اندر جب ثبات ہو جاتا ہے تو دل میں گول چراغ کی صورت ہو جاتی ہے، پھر اس کے بعد دل میں ایک ستارہ ظاہر ہوگا اور چاند نظر آئے گا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوگا کہ وہ روشنی آسمان پر آگئی ہے اور اسی روشنی میں اس عالم کی تمام چیزیں دکھائی دیں گی۔ اس صورت میں یہ چاند کی صورت حقیقتِ محمدیہ کی صورت ہوگی۔

تلاوتِ قرآن:

''گویند کہ حضرت ایشاں بہ سیّد لیٰسین می فرمودند کہ تلاوتِ قرآن مجید را قیام نمائید و ہر چہ موجب غفلت است از حضورِ حق از و احتراز کنید۔ اگر گفتہ مرا ملازم گیرید ہمچو من خواہید شد (یعنی مجمع البحرین)۔''

کہتے ہیں کہ حضرت سیّد لیٰسین سے فرماتے تھے کہ تلاوتِ قرآن مجید ہمیشہ کیا کرو۔ اور جو

چیز کہ حضورِ حق میں غفلت کا سبب ہو اس سے پرہیز کرو۔ اگر میری بات پر ہمیشہ عمل کرو گے تو میرے ہی جیسے بن جاؤ گے (یعنی مجمع البحرین)۔

''چوں کسی را دیدند کہ اکثر و بیشتر اوقات بتلاوت می گزراند۔ فرمودندے کہ بتلاوت کہ می کنید چرا شغل نمی کنید۔ دیگرے را فرمودندے کہ آب کہ می آرو چرا نمی کنید۔''

جب کسی کو دیکھتے کہ وہ زیادہ تر اوقات تلاوت ہی میں لگاتا ہے تو فرماتے کہ تلاوت اتنی زیادہ کیوں کرتے ہو، شغل (مراقبہ) کیوں نہیں کرتے۔ دوسرے سے فرماتے کہ جو چیز آب و تاب لاتی ہے وہ کام کیوں نہیں کرتے۔

لذتِ عمل:

''می فرمودند کہ کسی بذکر رسید و کسی بہ فکر و کسی بدرود۔ و فرمودند کہ نفس را امتحان بحالت شدت و بحالت آسائش کہ کدام حال ذوق اعمال دارد و بر سوانح احوال نگاہ دارد۔''

فرماتے تھے کہ کوئی تو ذکر کر کے معرفت کے درجے کو پہنچا، کوئی فکر کر کے اور کوئی درود پڑھ کے۔ اور فرماتے تھے کہ نفس کا امتحان تکلیف اور آرام دونوں حالتوں میں کیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کون سی حالت میں عمل کی لذت حاصل ہوتی ہے تو فائدہ ہوگا کہ جب نئی حالتیں وارد ہوں گی تو نفس کو قابو میں لا سکے گا۔

مرشد کی ضرورت:

''می فرمودند کہ از مشقت معرفت خدا را حاصل کردن ہم چنیں است کہ کسے کہ مرشد فیض بخش ندارد۔ آں کس را در طریق شطار چنیں مشقت با نیست۔ پرسیدند کہ اگر ایں قدر مشقت کند حاجتِ مرشد ہم دارد؟ فرمودند وہ وہ! مرشد پردہ و حجاب را می درد۔''

فرماتے تھے کہ ریاضت و محنت سے حد تک پہنچنا اس وقت ہوتا ہے کہ جبکہ اس کا کوئی

فیض بخش مرشد نہ ہو۔ شطاریہ طریقہ میں اتنی مشقتیں نہیں ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس صورت میں بھی مرشد کی حاجت ہے جبکہ وہ اتنی مشقتیں اُٹھاتا ہے تو فرمایا واہ واہ! مرشد تو حجاب اور پردہ دور کرتا ہے۔ (اس کی بہرحال ضرورت ہے۔)

''می فرمودند کہ ریاضت بے امر مرشد خشکیٔ دماغ یا ضعفِ بدن یا زیانے دیگری ارد۔''

اور فرماتے تھے کہ ریاضت بغیر مرشد کے حکم کے خشکیٔ دماغ یا ضعفِ بدن پیدا کرتی ہے یا اس سے دوسرے نقصانات لاحق ہوتے ہیں۔

''می فرمودند کہ تحتِ عظمتِ بزرگاں مخفی شدہ باشد، چوں جدا می شوند ترقی شتاب ظاہر خواہد شد۔ و می فرمودند زجر و غضبِ مرشد نوازش و مرحمت است۔ بیت:

دشنام اگر ازاں لبِ لعلت بمن رسد
در گوشِ دل ز مطربِ خوش خواں بود اَلَذ''

اور فرماتے تھے کہ بزرگوں کی عظمت کے تحت نگاہوں سے پوشیدہ ہوا کرتے ہیں۔ جب طالب ان کی صحبت سے جدا ہوتا ہے تو جھٹ ترقی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی فرماتے تھے کہ مرشد کا غصہ و غضب بھی نوازش و مہربانی ہے۔ اس شعر کے بمصداق کہ اگر گالی لبِ لعلیں سے مجھے ملے تو میرے کان کے لیے اچھی آواز والے گویے کے نغمے سے بھی زیادہ لذت بخش ہے۔

سلسلۂ شطاریہ کی فضیلت:

''فرمودند کہ قطب سلسلۂ شطاری و قطب سلاسل دیگر برابر نیست۔ پرسیدند کہ مشائخ دیگر مقامات باطنی را تفصیل می کنند۔ اما در خانۂ ایشاں تفصیل مسموع نیست، فرمودند کہ مردم ما باوّل قدم بذات بحت می رسند، در مقام باطنی ایشاں را وقفہ نمی شود۔ و می فرمودند کہ صوفی فرض و سنت موکدہ را گزارد۔ دیگر ضروری نیست۔ پرسیدند کہ ریاضت در کدام سلسلہ بسیار است و در کدام کم؟

فرمودند کہ ریاضت بسیار در سلسلۂ سہروردیہ است کہ ایشاں دعوت می کنند و در سلسلۂ شطاریہ کم است۔''

فرماتے تھے کہ سلسلۂ شطاریہ کا قطب اور دوسرے سلسلوں کا قطب برابر نہیں ہو سکتا۔ لوگوں نے پوچھا کہ دوسرے مشائخ مقاماتِ باطنی میں تفصیل بیان کرتے ہیں مگر ان کے مکان (یعنی شطاریوں کے یہاں) تفصیل نہیں سنی گئی۔ فرمایا کہ ہمارے لوگ پہلے ہی قدم میں ذاتِ بحت کو پہنچ جاتے ہیں۔ مقام باطنی میں ان کو توقف نہیں ہوتا۔ اور فرماتے تھے کہ صوفی فرض اور سنت مؤکدہ ادا کرے، دوسرے ضروری نہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ ریاضت کون سے سلسلے میں بہت زیادہ ہے اور کون سے سلسلے میں کم؟ فرمایا کہ سہروردیہ سلسلے میں ریاضت بہت ہے کیونکہ وہ دعوت کرتے ہیں اور شطاریہ سلسلے میں کم ہے۔

''شیخ بایزید ثانیؒ کہ از جملہ مخلصاں و مریداں ایشان بودند، پرسیدند کہ شاہ سلامت اراجازت باشد فلاں ذکر را با حبس نفس کہ در سلسلۂ نقشبندیہ است، اشتغال نمایم؟ فرمودند کہ آن شغل و ذکر را بے حبس نفس بجا می آریم۔ بسبب آنکہ حبس دم موجب ضعف بدن است۔ چوں بدن ضعیف گشت قلب نیز ضعیف می کرد۔ و دریں اثنا شخصے ریاضت و محن شیخ فرید گنج شکر قدس سرہ و ابراہیم ادہمؒ وغیرہ را مذکور کرد۔ فرمودند ایں ریاضت ایشاں قبل از ملاقاتِ مرشد بود۔ مرشد جز از شغل چیزی نمی فرماید۔''

شیخ بایزید ثانیؒ جو کہ آپ کے مریدوں اور مخلصوں میں سے تھے، نے پوچھا کہ شاہ سلامت! اگر اجازت ہو تو فلاں ذکر حبس دم کے ساتھ کروں جیسا کہ سلسلۂ نقشبندیہ میں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہم وہ شغل اور ذکر بغیر حبس دم کے بجا لاتے ہیں کیونکہ حبس دم سے بدن ضعیف ہوتا ہے۔ جب بدن ضعیف ہوا تو دل بھی کمزور ہوتا ہے۔ اس اثنا میں کسی نے حضرت شیخ فرید گنج شکرؒ اور حضرت ابراہیم ادہمؒ کا ذکر کیا اور ان کی ریاضتوں اور محنتوں کے متعلق بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کی یہ ریاضتیں ان کے مرشدوں کی ملاقات سے پہلے کی تھیں۔ مرشد شغل کے سوا اور کچھ زیادہ نہیں فرماتا۔

کثرتِ ریاضت سے ممانعت :

''می فرمودند کہ کشائش روز دعوت و کثرت صوم نمی شود چنانکہ در شغل می شود۔''

فرماتے تھے کہ کشائش اور ترقی باطن دعوت اور زیادہ روزہ رکھنے سے نہیں ہوتی جیسی کہ شغل میں ہوتی ہے۔

''گویند کہ روزے شیخ احمد از خدمت ایشاں سوال کرد کہ مرا ذوق کثرتِ صوم است۔ ایشاں فرمودند کہ مارا متابعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم باید کرد۔ غداءً و عشیاً۔''

کہتے ہیں کہ ایک روز شیخ احمد نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے زیادہ روزہ رکھنے کا ذوق ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنی چاہیے یعنی رات کو کھانا اور صبح کو روزہ۔

''آں ریاضت ہائے سخت کہ بعضی مردم کردہ اند کہ بغیر مرشد خود از باطن چیزی بدر آرند۔ و آن ریاضت ہائے سخت قبل از ملاقات مرشد بودہ است۔ بسیار اولیاء بے ریاضت بخدا رسیدہ اند۔''

وہ سخت ریاضتیں جو بعض لوگوں نے کی ہیں وہ بغیر مرشد کی رہنمائی کے کیں۔ اور اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے ہیں تو اس وجہ سے تھیں کہ انھیں مرشد سے ملاقات نہ حاصل ہوئی اور ایسا تو بہت ہوا کہ بہت سے اولیاء بغیر ریاضت کے بھی درجۂ معرفت کو پہنچے ہیں۔

''می فرمودند کہ حضرت مولانا جامی قدس سرہ تقدیراً کل صد درہم فرمودند۔ پس معلوم شد کہ افراطِ ریاضت موقوف بر ولایت و مناصبِ عالیہ نیست۔ بہترین طریق آنکہ اشتہا باقی دارد۔ و ذکر جہر کند۔ می دانم ریاضت ہیچ نمی شود و ہر چہ می شود از شغل است۔''

اور فرماتے تھے کہ حضرت مولانا جامی قدس سرہ نے ریاضت کے لیے کل سو درہم وزن کھانے کا اندازہ رکھا ہے جو کافی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ ریاضت زیادہ کرنا ولایت اور بلند

مناسب پر موقوف نہیں ہے۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اشتہا باقی رکھے۔ اور ذکر بلند آواز سے کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ریاضت سے کچھ نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوتا ہے شغل (مراقبہ) سے ہوتا ہے۔

اصولِ ریاضت :

''می فرمودند کہ چندیں اشغال از اں تعلیم می کنم کہ پنج وقت شما خالی نباشد۔ یعنی در حال کہ باشید شغل مناسب آن حال بکنید۔''

اور فرماتے تھے کہ چند اشغال کی تعلیم اس لیے دیتا ہوں تاکہ تمھارے پانچ وقت اس سے خالی نہ ہوں۔ یعنی جس حال میں رہو اسی حال کے مناسب شغل اختیار کرو۔

''و می فرمودند کہ دہ روز تاثیر است ہر یک شغل را دہ روز بکنند از یں کم نباید۔ و دوازدہ رکن مبدا و معاد۔ و سہ پایہ سمیع و بصیر و علیم انسب است۔''

اور فرماتے تھے کہ دس روز میں تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔ ہر شغل دس روز تک کرنا چاہیے، اس سے کم نہیں۔ اور بارہ رکن مبداء و معاد، تین پائے سمیع، بصیر اور علیم کے مناسب تر ہیں۔

''و می فرمودند اگر ہمہ گزاشتہ نہ بیند زود تر بہ مقصود برسد۔ در دو سہ اربعین بلکہ در یک چلہ بلکہ در دہ روز۔''

اور فرماتے تھے کہ اگر تمام چھوڑ کے نہ دیکھے تو زیادہ جلد مقصود کو پہنچے گا۔ دو یا تین چلے بلکہ ایک چلہ بلکہ دس روز میں مقصد حاصل ہو جائے گا۔

''و می فرمودند کہ تقدیم اذکار از جہت صفائی قلب است۔ کسیکہ فربہ باشد او را بسیار نافع بود تا باں قابل شغل کرد و از جملہ علامت صفا آن است کہ شوق و محبت و ولولہ پیدا می شود، چیزے از آثار توحید ہم باید۔''

اور فرماتے تھے کہ ذکرِ الٰہی کا مقدم کرنا اس لیے ہے کہ اس سے صفائی قلب حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص زیادہ فربہ ہو اس کے لیے بے حد مفید ہے کیونکہ اس کی وجہ سے وہ شغل کے قابل ہو جائے گا۔ اور صفائی کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ شوق اور محبت و ولولہ دل میں پیدا ہو جائے اور توحید کے اثرات بھی ظاہر ہوں۔

''می فرمودند کسیکہ ذکر جلی می کند او را شوربہ ہائے چرب باید خورد۔ وی
فرمودند کہ یک طالب من بود کہ کتورہ ہمراہ خود می داشت۔ ہر گاہ کہ چیزے
فتوح یافتے روغن می گرفتے۔ و فرمودند کہ ہوائی اینجا روغن باید خورد۔ و بارہا می
فرمودند کہ این دعوتے کہ می گویم حیلۂ تجویع است۔ اگر مجرد جوع بگویم محنت
سخت خواہد شد (در دعوت) ہم ریاضت حاصل است و ہم دعوت اسماء۔''

اور فرماتے تھے کہ جو شخص ذکر جلی کرے اس کو روغنی شوربہ کھانا چاہیے۔ اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میرا ایک طالب علم جو ہمیشہ کٹورہ ساتھ رکھتا۔ جس وقت کہ اس کو فتوح نصیب ہوتی روغن لے لیا کرتا تھا۔ اور فرماتے کہ یہ دعوت جو میں کر رہا ہوں بھوکا رکھنے کا ایک حیلہ ہے۔ اگر صرف بھوک کہوں تو بڑی سخت تکلیف اُٹھانی ہوگی اور دعوت میں ریاضت بھی ہو جاتی ہے اور دعوت اسماء بھی۔

غذا کے متعلق ہدایات:

''می فرمودند کہ دو بار خورد یا چہار بار۔ اندک اشتہا باقی دارد۔ و می
فرمودند راحت موجب کسل است۔ و فرمودند ہر قدر ریاضت و سلوک در جوانی
می شود سودمند می باشد۔ و می فرمودند ہمہ احوال باطن برحسب غذا است۔ غذا از
جبر و ظلم نباید و در روزہائے کہ صوم حرام است آخر روز دانۂ زیرہ بخورد۔ و خدام را
می فرمودند کہ خلوت انفع از جوع است۔ و می فرمودند کہ علامت شہوت صادق
آنست کہ اگر از نانِ خشک یابد بمیل خورد۔ و شہوت کاذب آنست کہ طعمۂ غیر
متعاد را تمنا کند و طعامیکہ حاضر آمدہ آنرا نخواہد۔ و باں راضی نگردد۔''

اور فرماتے تھے کہ طالب دو بار کھاوے یا چار بار کھائے لیکن تھوڑی اشتہا باقی رکھے۔ اور فرماتے تھے کہ آرام و آسائش سے کاہلی پیدا ہوتی ہے۔ اور فرماتے کہ جتنی ریاضت اور سلوک جوانی میں ہو اتنا فائدہ مند ہوتا ہے۔ اور فرماتے کہ کل احوال باطن کا غذا کے موافق ہوا کرتا ہے۔ غذا جبر اور ظلم سے حاصل کی ہوئی نہ ہونی چاہیے۔ جن دنوں میں کہ روزہ رکھنا حرام ہے شام کو زیرہ کا دانہ کھالے۔ اور خادموں سے فرماتے کہ خلوت میں رہنا بھوکا رہنے سے زیادہ نفع بخش ہے۔

اور فرماتے تھے کہ سچی بھوک کی نشانی یہ ہے کہ اگر سوکھی روٹی ملے تو رغبت سے کھائے۔ اور جھوٹی بھوک کی نشانی یہ ہے کہ جس کھانے کی عادت نہیں وہ مانگے اور جو کھانا حاضر ہو اسے جی نہ چاہے اور اس پر راضی نہ ہو۔

''می فرمودند کہ پیاز خوردن و در حجرہ نگاہ داشتن اہلِ شغل را مناسب
ندارد۔ و پرسیدند کہ معاملۂ موکلات خود نیست۔ فرمودند کہ در اصل مناسب صفاء
است و نباید۔''

اور فرماتے تھے کہ پیاز کھانا اور حجرہ میں نگاہ رکھنا اہلِ شغل کے لیے سزاوار نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ مؤکلات کا معاملہ تو نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کام اصل صفائی کے مناسب نہیں ہے، اس لیے ایسا نہ کرنا چاہیے۔

''طالب را طعام و جامہ می باید بہ ہیچ چیز دیگر حاجت ندارد۔ کسے گفت
غذائے لطیف و لذیذ باید خورد تا قوت شود۔ فرمودند طعامی کہ لذیذ باشد زیادہ
خوردہ می شود۔ اصل المراد من الزیادۃ الزیادۃ الموذی۔ و شکم سیری در
عبادت کاہلی می آرد۔''

طالب کو خوراک اور پوشاک چاہیے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ کسی نے کہا اسے لطیف اور لذیذ غذا کھانی چاہیے تا کہ قوت حاصل ہو۔ فرمایا کہ جو کچھ کھانا لذیذ ہوتا ہے زیادہ کھایا جاتا ہے۔ یہاں زیادتی سے مراد تکلیف دینے والی زیادتی ہے۔ پیٹ بھر کھانا عبادت میں کاہلی پیدا کرتا ہے۔

''می فرمودند کہ روغن بسیار خورید و گوشت ترک دہید۔ پرسیدند کہ در
شغل ہم پرہیز کند؟ فرمودند کہ آن غذائے کہ بہ قہر و جبر حاصل است۔ ترک
دہد چوں ماہی و گوشت۔ پرسیدند چون اشتہا پردہ سوز است چرا بہ حیلۂ گوشت
زیادہ نکند؟ فرمودند در وجود کثافت نماید از کثرت طعام کثافت و ثقل در اعضاء
پیدا می شود۔ و بسیار اشتہاء موجب پُری بدن است از خون۔''

اور فرماتے تھے کہ روغن زیادہ کھاؤ اور گوشت چھوڑ دو۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا شغل کے

دنوں میں بھی پرہیز کریں؟ فرمایا ہاں! جو غذا کہ قہر اور جبر سے ملتی ہے جیسے مچھلی یا گوشت، اس کو ترک کردے۔ لوگوں نے پوچھا کہ جب اشتہاء پردہ جلا دیتی ہے تو کیوں گوشت کے حیلے زیادہ نہ کرے۔ آپ نے فرمایا کہ وجود میں کثافت معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ کھانے سے اعضا میں کثافت اور بوجھل پن بڑھ جاتا ہے اور زیادہ اشتہا کے سبب بدن خون سے بھر جاتا ہے۔

کتب تصوف پڑھنے کی تلقین :

''وی فرمودند کہ مرشد آنرا باید کہ چوں طالب ملول شود از اعمال و اشغال بقدر دفع ملال علم توحید و باطن از کتب موحداں مطالعہ کردن فرماید۔''

اور فرماتے تھے کہ مرشدوں کو چاہیے کہ جب طالب اعمال و اشغال سے گھبرا جائے تو اس سے کہیں کہ وہ صوفیائے موحدین کی کتابوں کا مطالعہ کریں تاکہ علم توحید اور علم باطن کے سبب ملال و بیزاری دور ہو جائے۔

فلسفہ وحکمت کا مطالعہ :

''یکے گفت کہ در خواندن کتاب ہائے حکمت فائدہ چیست؟ فرمودند: فائدہ ایں سخن ہا یعنی شرح مواقف ونحوہا آنست کہ عقیدہ محکم می شود۔ خلیفۂ مولانا گفتند مرا از خواندن علم حکمت در عقیدہ تردد واقع می شود۔ فرمودند ترک دہید ترک دہید۔''

ایک شخص نے کہا کہ فلسفہ کی کتابوں کے پڑھنے میں کیا فائدہ ہے؟ تو فرمایا اس سے فائدہ یہ ہے کہ جو باتیں اس کے ذہن و دماغ میں ہیں اس کے لیے دلیل ہاتھ آجائے گی اور عقیدہ اور زیادہ مضبوط و راسخ ہو جائے گا۔ مولانا کے ایک خلیفہ کہنے لگے کہ فلسفہ کی کتابوں کو پڑھنے سے تو مجھے خلجان اور تردد بڑھ جاتا ہے۔ فرمایا تو اس حالت میں چھوڑ دیجیے۔

طلبہ کے لیے تصوف کی ممانعت :

''طالب علم را از تصوف مانع بودند چوں در وادئ تصوف قرار یافت او را از خواندن مانع بودند شغل، در وقت خواندن اشتغال در خلوت می فرمودند ہمہ

تاثیر بہ ریاضت می شود۔''

طالب علم کو تصوف سے منع کرتے تھے کیونکہ جب وہ وادئ تصوف میں گھس جائے گا تو پڑھنے میں تصوف کے اشغال رکاوٹ بنیں گے۔ پڑھنے کے زمانے میں خلوت کا شغل کافی ہے اور اس سے وہ تمام چیزیں حاصل ہوتی ہیں جو ریاضت سے ملتی ہیں۔

تقسیم عمل :

''فرمودند قبل ام فتح باطن و ترقی درویش را تدریس بغایت زیاں باشد۔ چنانچہ علماءِ حفظ ملک بسپاہیاں گذاشتند و خود بتدریس مشغول شدند زیرا کہ توجہ بحفظ ملک خلل در تدریس است۔ ہم چناں صوفیاں را باید کہ تدریس بہ علماء گزارند خود باشتغال باطنی کوشند کہ قبل از ترقی در باطن سالک را در گفتن بغایت مخل است۔ چنانکہ حضرت مولوی در مثنوی فرمودند۔

منصب تعلیم نوع شہوت است
ہر خیالی شہوتی در شہوت است''

فرماتے تھے کہ باطنی فتح اور ترقی سے پہلے درس دینا نہایت نقصان دہ ہے۔ جس طرح کہ علماءِ ظاہر نے ملکوں کی حفاظت کی ذمہ داری سپاہیوں پر چھوڑ کے خود تدریس کے مشغلے میں لگ گئے۔ اسی طرح صوفیوں کو چاہیے کہ علوم ظاہری کی فائدہ بخشی کا کام علماء پر چھوڑ کے خود اشتغال باطنی میں کوشش کریں کیونکہ باطنی ترقی کے قبل سالک کے لیے درس دینا نہایت مضر ہے۔ جیسا کہ مولانا روم نے مثنوی میں فرمایا ہے: تعلیم کا منصب ایک قسم کی نفسانی خواہش ہے اور ہر نفسانی خواہش راہِ حق میں نفسانی خواہش ہی کا باعث ہوتی ہے۔

تقوٰی میں کمی کا احساس :

''بعد از فتح باطن فی الجملہ بے اختیار در تقوٰی ظاہری نقصانی واقعہ می شود۔ و بریں نقص اظہار عجز و اندوہ می کند تا خود را منظور نظر حق گرداند۔ لعل ہذا قالہ لا حالہ۔''

کبھی کبھی باطن کی کشادگی کے بعد یکایک ظاہری تقویٰ میں کمی آجاتی ہے۔اور اس کمی پر اس کے اندر اظہارِ عاجزی اور جذبۂ ندامت پیدا ہوتا ہے۔اس طرح وہ خدا تعالیٰ کی نظر میں نہایت مقبول و محبوب ہو جاتا ہے۔

فرقِ احوال :

''کسی گفت کہ فلاں کس روزہ بسیار می دارد و ریاضت می کند۔فرمودند: او ہیچ خبر از باطن ندارد۔

فرمودند بعضے طالباں اند کہ ذوقِ باطن یافتہ بر ہماں قانع می شوند و در طلبِ ترقی نمی شود۔ بواسطۂ آں ناقص می مانند و از ترقی محروم۔''

کسی نے کہا کہ فلاں آدمی روزہ بہت رکھتا ہے اور ریاضت بھی۔فرمایا اسے اپنے باطن کی خبر نہیں ہے۔فرمایا بعضے طالب تو تھوڑے سے ذوقِ باطنی پر قانع ہو جاتے ہیں تو پھر وہ طلب میں ترقی نہیں کر پاتے۔اس کی بنا پر وہ ناقص رہ جاتے ہیں اور ترقی سے محروم رہ جاتے ہیں۔

کسبِ معاش :

''بار ہا می فرمودند کہ در باب معیشت تدبیر باید بود تا تشویش و محتاجِ استقراض نشود۔''

اکثر فرماتے تھے کہ روزی کے باب میں تدبیر اختیار کرنی چاہیے تاکہ ذہنی پریشانی اور قرض لینے کی ضرورت نہ پڑے۔

کشائش کا عمل :

''و می فرمودند کہ مردے نزد سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم آمدہ از فقر و تنگدستی شکایت کرد۔آنحضرتؐ فرمودند کہ چوں بمنزل خاصۂ خود در آئی سلام گوئی۔اگر کسی باشد و گرنہ سلام فرست بر من۔و یک بار سورۂ اخلاص بخواں۔آں مرد را توفیقِ الٰہی رفیق شد۔در معیشتِ وے وسعتے پیدا شد کہ ہم خویشاں و ہمسائگاں از فائدہ گرفتند۔السلام علی النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ السلام

علینا و علی عباد اللہ الصالحین. و قال الشیخ یعقوب انہٗ مجرّب۔''

اور فرماتے تھے کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں آیا اور اپنی محتاجی و تنگدستی کی شکایت کی۔آپؐ نے فرمایا کہ جب اپنی خاص منزل میں داخل ہو تو اگر وہاں کوئی شخص ہو تو اس کو سلام کرے اور اگر کوئی بھی نہ ہو تو مجھ پر ایک بار سلام بھیجے اور ایک بار سورۂ اخلاص پڑھے۔اس شخص کو توفیق نصیب ہوئی اور اس کی حالت میں کشائش ہوئی یہاں تک کہ سب خویش و ہمسایوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔شیخ یعقوب نے فرمایا کہ یہ آزمایا ہوا عمل ہے۔

خوفِ خاتمیت کا عمل :

''گفتم کہ خوفِ خاتمیت بر من غالب شدہ است۔فرمودند: بعد ہر فریضہ "ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا و ھب لنا من لدنک رحمۃً انک انت الوھاب''

(جامع ملفوظات) کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ مجھ پر خاتمے کا خوف طاری ہو گیا ہے تو فرمایا کہ ہر فرض نماز کے بعد یہ دعا پڑھے:"ربنا لا تزغ ....''

☆☆☆

گجراتی زبان میں حضرت شاہ وجیہ الدین کی ایک سوانح عمری 'گلزار وجیہہ' یا 'جیون چرتر' کے نام سے حافظ اسماعیل محمد نے لکھی ہے۔اس میں بھی 'سنہری سخن' کے عنوان سے کچھ ملفوظات نقل کیے گئے ہیں۔اس میں سے یہاں ہم چند نقل کرتے ہیں:

حقیقتِ عبادت :

''ضعیفوں کی مدد کرو۔غریب لوگوں کی اپنے ہاتھ سے مدد کرو۔یہ ہاتھ کی عبادت ہوئی۔علمائے کرام، اولیائے عظام اور قرابت مندوں کی طرف پیدل چل کر جانا پیروں کی عبادت ہے۔کائنات کے مشاہدے سے خدا کی عظمت پیدا ہوتی ہے اور یہ آنکھ کی عبادت ہے۔عمدہ کلام کے سننے سے روحانی لذت حاصل ہوتی ہے اور یہ کان کی عبادت ہے۔شغل و فکر سے کمال حاصل

ہوتا ہے۔تھوڑے لوگ تو ذکر کر کے ولایت کے درجے پر پہنچ گئے۔ روحانی طہارت سے باطنی ترقی حاصل ہوتی ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور سے بڑھتے بڑھتے خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ترکِ دنیا اور آخرت کا تصور دل کی عبادت ہے۔کلامِ الٰہی کی تلاوت اور مقبول دعائیں پڑھنا زبان کی عبادت ہے اور لقاءِ رب کا شوق روح کی عبادت ہے۔''

منازلِ سلوک:

آپ کے مرید سیّد یٰسین نے آپ سے سوال کیا کہ کیا مرشد کی خدمت میں رہنے والے بھی پیشوا ہوسکتے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ ''تھوڑے دن بھی رہے تب بھی ہوسکتا ہے لیکن روحانی ترقی مرشد کے فیض اور تربیت پر منحصر ہے۔حضوری میں بہت جلد ترقی ہوتی ہے، یہاں تک کہ دنیا کے اندر انقلاب پیدا کرسکتے ہیں اور معمولی توجہ اور اشاروں سے ہزاروں گمراہوں کو کامل اور فاسقوں کو ولی بنا سکتے ہیں۔ جب تک طالب منزلِ مقصود پر نہیں پہنچتا اس درمیان دنیوی چیزیں اس کو لبھاتی رہتی ہیں، اس لیے ان کو دل سے نکالنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔پھر حال یہ ہوگا کہ 'من کان لِلّٰه کان اللّٰه له' کے مطابق جو خدا کا ہوگیا تو خدا اس کا ہوجائے گا۔ اور ایک ضرب سے سب چیزیں مہیا ہوجاتی ہیں۔ دوسری ضرب سے سب کچھ ملتا ہے اور پھر 'من ترک الکل وجد الکل' کا منظر دکھائی دے گا۔''

- جب طالب شغل کے درمیان گھبراتا ہے تو مرشد کا فرض ہے کہ اس کو توحید کے مضمون پر علماء کی کتابیں اور ان کے بیانات پڑھنے کا حکم دیں۔
- صالح کے لیے یہ فرض ہے کہ زبان اور قدم کا خیال رکھے۔دنیا سے بہت میل جول نہ کرے۔ان کے گھر نہ جائے اور خاموشی اختیار کرے۔
- جس شخص کو اللہ فقیری کی دولت دیتا ہے اس کے نفسِ امارہ کو بھی فنا کردیتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کے سوا اس کی کوئی طلب باقی نہیں رہتی۔
- ایک دوست کو تلقین کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''اللہ اللہ کہو اور اس کی وحدانیت سے خود کو الگ سمجھتے ہوئے سر کو سینے کی طرف جھکاؤ۔موت سے مت ڈرو لیکن اللہ کی یاد کیا کرو۔اور ذاکر یہاں تک ہوجاؤ کہ بدن کا ہر عضو خدا کے ذکر کی آواز کرے اور نیند میں

بھی خدا سے غافل نہ رہو۔

پاداشِ عمل:

حضور کے پوتے اسد اللہ کہتے ہیں ''قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِهٖ'' کی تفسیر بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ''بہت سے مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت اور کبریائی کے مطابق عمل کرتے ہیں اور بندہ اپنی بندگی اور عاجزی کے مطابق عمل کرتا ہے۔بعض لوگوں نے کہا ہے کہ بندے کو خدا جتنا توفیق دیتا ہے بندہ اتنے پر عمل کرتا ہے۔'' درمیانِ تقریر میں آپ کے پوتے نے عرض کیا دادا جان! اگر کسی کو خراب بدلہ ملا ہو تو کیا کرے؟ تو جواب دیا کہ ''بدلے کے بارے میں بندے کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ بندے کو تو یہی کہنا چاہیے کہ یا پروردگار! ہمیں معاف کر کیونکہ ہم گناہ کرتے ہیں اور اچھا بدلہ چاہتے ہیں۔تو اللہ میاں جواب دیتے ہیں کہ میں حکمت والا ہوں اور انصاف پسند ہوں۔اور آپ کیا کریں گے وہ مجھے معلوم ہے۔''

آدمی اور جانور میں اتنا ہی فرق ہے کہ آدمی میں عقلِ سلیم ہے اس لیے وہ ہر بات کی کھوج کرتا ہے۔لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دیوانے اور بچے غیر عقلِ سلیم کے ہوتے ہیں۔جتنی دانائی ہوتی ہے اتنی ہی اللہ کی پکڑ ہوتی ہے۔

حلال روزی نہ ملے تو؟

کسی نے پوچھا حلال روزی میسر نہ ہو تو کیا کرے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ ''جب تک نماز پڑھنے کی طاقت ہو اس وقت تک حرام نہ کھائے۔ اور جب نماز کی طاقت ختم ہوجائے تو مردار بھی کھا سکتے ہیں۔ہاں کسی کا حق مت کھاؤ۔نہ کسی کی چیز لو۔بندہ تو محتاج ہے اور کسی چیز کا مالک نہیں، نہ ذات کا، نہ صفات کا، اور نہ افعال کا۔''

فقر کا معیار:

ایک صاحب حبیب صوفی نام کے تھے جو حضور کے مرید تھے۔وہ ہاتھ میں کتاب لے کر آئے تو آپ نے ان سے پوچھا یہ کیا ہے؟ پھر فرمایا ''یہ کتاب جسے خواہش ہو اس کو دے دو اور ہماری حضوری میں رہو۔'' اس کے بعد آپ نے فرمایا: ''چار چیزیں یاد رکھو:

(۱) ہمارے جیسے کپڑے پہنو یعنی کالے کپڑے پھینک دو۔ (۲) نذر و نیاز جو ملے تو اسے لوٹاؤ مت بلکہ خرچ کر ڈالو۔ (۳) رات اور دن کے اندر اگر سوکھی روٹی مل جائے تو مخلوق کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ (۴) ہمیشہ نفسِ امارہ پر کڑی نگاہ رکھو اور پہرہ دیتے رہو کہ شیطان کہیں گھس نہ بیٹھے۔ (۵) مسجد میں جاؤ تو "اِغْفِرْ لِیْ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ" پڑھو۔ پھر ہنس کر بولے ایک حبیب عجمیؒ تھے اور آپ حبیب گجراتی ہیں۔

کمالِ فنا:

لذتِ نفس کے بارے میں ایک شخص نے پوچھا تو جواب میں فرمایا ''نہایت ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔ اور بندے کے لیے ضروری ہے کہ ہر حالت میں صابر و شاکر رہے۔ صبر و رضا جہاں ہو وہاں نفسانیت نہیں رہتی۔ دوئی باقی رہتی ہے لیکن تجلی ظاہر ہوتی ہے تو دوئی مٹ جاتی ہے۔ جہاں تجلی پاؤ گے وہاں فنا کی کمالیت بھی پاؤ گے۔ اور پھر حال یہ ہوگا کہ کوئی تلوار مارے گا تو اثر نہ ہوگا۔ فنا کا کمال تو یہ ہے کہ اثر نہ ہووے۔ اس لیے تو عارف کہتے ہیں وجد میں رقص کرو اور حسبِ رضا کام کرو۔ پھر ہنس کر فرمانے لگے مجھ سے کشف و کرامت چاہتے ہیں، واہ واہ! خوب خدا کے طالب نکلے۔

ملفوظات کی لسانی اہمیت

اُردو زبان کا خمیر ہندوستان کی علاقائی زبانوں سے تیار ہوا ہے۔ ہندوستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے الفاظ اس میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اُردو زبان سے ان کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

آمد و رفت کے وسائل کی کمی کی وجہ سے پہلے زبانوں کی نشو و نما مقامی ہوتی تھی اور ایک مقام کی بولی بولنے والوں کی اتنی تعداد دوسری بولی کے خطوں میں نہیں پہنچ سکتی تھی کہ بولیوں کا خلط ملط عمل میں آسکے لیکن مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے عرصے کے اندر ہی سارے شمالی ہند میں اور علاء الدین خلجی کے زمانے سے دکن میں بھی ہند آریائی بولیوں کا میل ملاپ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اور ایک بولی جو مسلمانوں نے اختیار کر لی تھی اسی کے آثار مختلف بولیوں کے علاقوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ملنے لگتے ہیں۔

اس نئی بولی کے ابتدائی نمونے پہلے ہمیں فارسی تحریروں کے درمیان نظر آتے ہیں۔ تاریخ کی کتابوں، شعراء کے دواوین اور بزرگوں کے ملفوظات میں ہمیں ایسے بے شمار الفاظ سے سابقہ پڑتا ہے جنھیں ہم اصطلاحی طور پر نثر تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ ایک مربوط خیال کے اجزاء ہیں کیونکہ یہ بات تصور میں نہیں آسکتی کہ قوموں کی ذہنی نشو و نما کے کسی مرحلے میں بھی وہ صرف منفرد لفظوں میں یہ خیالات کو ظاہر کرتی رہی ہوں گی۔ لسانیات کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ

''زبان کی اکائی لفظ نہیں جملہ ہے۔ یعنی انسان نے جب بولنا شروع کیا تو وہ جملوں میں بولنے لگا نہ کہ الفاظ میں۔'' ہوسکتا ہے کہ یہ جملے کبھی لفظی جملے (Sentence Words) رہے ہوں گے[1]۔

اس اصول کی روشنی میں ان منفرد لفظی آثار کا مطالعہ بھی خارج از دلچسپی نہیں جنھیں فارسی دانوں نے ہندوستانی عوام کے مزاج کی رعایت سے بے اختیار استعمال کیے ہیں۔ اور یہی دراصل ان لفظوں کی تاریخی اہمیت ہے۔ فارسی تحریروں میں جگہ جگہ اُردو یا ہندوستان کی علاقائی زبان کے جو الفاظ یا ادھورے جملے دستیاب ہوتے ہیں ہماری زبان کے نثری ارتقا کے پہلے مرحلے کے نمونے ہیں۔

ساتویں صدی ہجری میں صوفیا، علماء، ادباء، شعراء، تاجر اور دستکار ایران و عرب سے ہندوستان میں آئے تو یہاں انھیں ایک نئی تہذیب، نئے سماج اور نئی بولی سے واسطہ پڑا۔ ان کے میل جول سے جو لسانی نتائج فطرتاً پیدا ہونے چاہییے تھے وہ نشوونما پا رہے تھے۔ اس زمانے میں تبلیغی اغراض اور تعلیمی مقاصد کے تحت بھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستانی عوام کو اپنے افکار و خیالات زیادہ قابلِ فہم اور ہمہ گیر محبت کی زبان میں سمجھائے جائیں۔ چنانچہ صوفیائے کرام کے طبقے نے خصوصیت کے ساتھ اس کا التزام کیا۔ ان کے فارسی ملفوظات کے درمیان اُردو کے ایسے کچھ جملے ٹپک پڑے ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بزرگانِ دین کو ایسے موقعوں پر اُردو جملوں سے مدد لینی پڑتی تھی۔ وہ اپنے مریدوں، عقیدت مندوں اور عوام سے گفتگو کرتے وقت اس کا لحاظ کرتے تھے کہ انھی کی بولی ٹھولی میں اپنا مافی الضمیر ادا کردیں۔ ان کے اس عمل سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُردو عوام کی بول چال کی زبان ہونے کی حیثیت سے فارسی کے مستند مصنفین اور خاص طور سے ارشاد و ہدایت پر اپنا اثر ڈالنے لگی تھی۔

اُردو کی نشوونما اور ارتقا میں جہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں نے حصہ لیا، ان میں گجرات بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ اُردو کے عظیم محقق حافظ محمود شیرانی اپنے ایک مضمون بعنوان ''گوجری یا گجراتی اُردو - دسویں صدی میں'' میں لکھتے ہیں:

۱: Elements of the Science of Language, 2nd edition, Taraporevala, p.9

''موجودہ معلومات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اُردو زبان کو ادبی شکل سب سے پہلے صوبۂ گجرات میں ملتی ہے۔ یہ صوبہ ۶۹۶ھ میں سلطنت دہلی کے زیرِ نگیں آتا ہے اور مسلمان آبادکار اس میں داخل ہوتے ہیں۔ تقریباً ایک صدی تک گجرات دہلی کے تابع رہا بعد میں آزاد ہوگیا۔ ہم اور واقعات سے اعراض کر کے امیر تیمور کے حملۂ ہند کا ذکر کرتے ہیں جس سے سرزمین گجرات میں اُردو کو بالواسطہ تقویت پہنچتی ہے۔ تیموری تاخت کی بنا پر لوگوں کی ایک کثیر تعداد صوبہ دہلی سے ہجرت کر کے گجرات میں جا کر آباد ہوجاتی ہے۔ چنانچہ مرآۃ احمدی میں مرقوم ہے:

''ہم دریں اثناء خبر رسید کہ حضرت (صاحب قِران امیر تیمور گورگاں) در دہلی نزولِ اجلال فرمودند و فتورِ عظیم دراں دیارا راہ یافت و خلق کثیر ازاں حادثہ گریختہ بہ گجرات آمد۔ مقارنِ ایں حال سلطان ناصرالدین محمود شاہ از دہلی فرار نمودہ بہ گجرات رسید و از آنجا مایوس شدہ بہ مالوہ رفت۔'' (مرآۃ احمدی: ۴۷)

گویا حملۂ تیمور سے دو امر متعلق ہیں: پہلے لوگوں کی مہاجرت، جس میں بعض مشاہیر اولیاء کے نام بھی ملتے ہیں مثلاً شیخ احمد کھتو، شیخ برہان الدین قطب عالم اور مولانا خواجگی۔ اس ہجرت سے گجرات میں اُردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ دوسرے شاہانِ گجرات کی سلطنت کا قیام۔ یہ واقعہ بھی اس صوبے میں اُردو کی آئندہ ترقی کے لیے ایک زبردست محرک ثابت ہوا۔ مسلمان جو مختلف مقاصد سے گجرات میں آباد ہوگئے تھے دہلی کی زبان اپنے ساتھ لائے تھے اور قومی زبان کی حیثیت سے اس پر نظر ڈالتے رہے۔ گجرات کی زبان اگرچہ گجراتی ہے لیکن مسلمانوں نے من حیث القوم اُردو کو اپنی زبان تسلیم کرلیا[1]۔

یہ زبان جسے اہلِ گجرات نے اپنی زبان چھوڑ کر اختیار کی، سماج کے مختلف طبقوں میں

۱: مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد اول، ص: ۱۶۰ تا ۱۶۲۔

اتحاد کا ذریعہ بنی اور سچ پوچھیے تو شمال جنوب میں اس کے ذریعہ رابطہ قائم ہوا۔ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی لسانی شواہد کی بنا پر کہتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں کے پے در پے سلسلوں اور دہلی کے عہدیداروں اور دوسرے لوگوں کے ذریعے اسی زبان کو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے صوبوں میں ایک سہولت بخش مشترک زبان کے طور پر پھیلنے میں مدد ملی[1]۔

اپنی دوسری تصنیف ''انڈو ایران اور ہندی' میں بھی انھوں نے اسی خیال کا اعادہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''یہ دکن تھا جس نے شمالی ہند کے لیے ادب کا نمونہ چھوڑا اور برج بھاشا جو علاقہ واری زبان تھی کے برعکس خاص ہندی اور ہندوستانی کی ترویج کی۔'' (ص: ۴۷)

بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ گجرات میں شروع ہی سے مسلمان 'گجری' بولتے رہے ہیں۔ گجری کی اصطلاح دراصل گجرات کی زبان سے فرق اور امتیاز کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر جس سے گجراتی اُردو مراد ہے۔ دکن میں اگر یہ اصطلاح کسی مصنف کے ہاں ملتی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مصنف گجرات کا باشندہ یا گجراتی الاصل ہے۔

بہرحال، گجرات میں اُردو نثر کے ارتقا میں بادشاہوں اور مشائخ کے وہ جملے اور فقرے خاصے اہمیت رکھتے ہیں جو انھوں نے مختلف مواقع پر اپنی فارسی گفتگو کے دوران ارشاد فرمائے۔

۸۰۳ھ/ ۱۴۰۰ء میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے سید برہان الدین عبداللہ بن محمود آغاز شباب میں پٹن (گجرات) میں تشریف لائے۔ پھر جب سلطان احمد بادشاہ گجرات (۸۱۴ھ/ ۱۴۱۱ء تا ۸۴۵ھ/ ۱۴۴۲ء) نے احمد آباد آباد کیا تو سید صاحب پٹن سے احمد آباد میں آکر سکونت پذیر ہوگئے۔ گجرات میں آپ کا لقب 'قطب عالم' اور آپ کے فرزند اکبر سراج الدین محمد بن عبداللہ کا لقب 'شاہ عالم' مشہور ہے۔ حضرت قطب عالم کے متعلق مشہور ہے کہ ایک روز آپ پچھلی رات کو اُٹھ کر باہر نکلے تو کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ آپ نے فرمایا ''لوہ ہے یا پتھر یا کیا ہے۔'' قطب عالم کا وصال ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء میں ہوا۔

جب شاہ بارک اللہ چشتی احمد آبادی نے بشارتِ نبوی کی تعمیل میں قطب عالم کے فرزند اکبر کو 'شاہ عالم' کا لقب دیا اور قطب عالم نے بشارتِ خواب اور لقب کا واقعہ سنا تو فرمایا کہ

1: The Origin and Development of the Bengali Language. P.12

''چشتیوں نے پکائی اور بخاریوں نے کھائی۔'' شاہ عالم نے ۸۸۰ھ/ ۱۴۷۵ء میں وصال فرمایا[1]۔

شاہ عالم کے اقوال بکثرت پائے جاتے ہیں جنھیں تحفۃ الکرام اور مراۃ سکندری کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی نے نقل کیے ہیں۔ ان میں سے ایک جملہ کے متعلق پروفیسر ابراہیم ڈار نے اپنے ایک مقالے میں یوں تفصیل لکھی ہے:

''مراۃ سکندری کے بیان کو ہم تسلیم کرلیں تو ماننا پڑے گا کہ سلطان محمود بیگڑھ اپنے بڑے بھائی قطب الدین خاں کی چال بازیوں کا شکار ہوجاتا۔ اگر شاہ عالم محمود کو اپنی پناہ اور حفاظت میں نہ لیتے۔ اس لڑکے فتح خاں سے (محمود بیگڑھ کا اصلی نام) مخاطب ہوکر آپ نے فرمایا کہ ''پڑھ ڈوکرے'' یعنی پڑھ اے پیر مرد۔ جبکہ اس کا بڑا بھائی اسے پکڑنے اچانک وہاں آگیا تھا۔ کہتے ہیں کہ شاہ عالم کے معجزانہ الفاظ کی بدولت محمود ایک پیر مرد دکھائی دینے لگا۔ آپ کے اور بھی اقوال ہیں مثلاً ''ارے میاں الولک ابولتے کیوں نہیں''۔ الولک یعنی بانکے وضعدار۔ ''راجن جی بکروٹے بدل بکروٹا۔'' اور ''جو راجن جی کا رونہہ نہ بھایا ھووے تو تجھ جیسے فقیروں کی برسوں تیں کتا سی کرے۔'' (بحوالہ تحفۃ الکرام، جلد اوّل، ص: ۳۱)

تاریخ میں اسی سلطان محمود بیگڑھ سے ایک ایسی کہاوت منسوب ہے جو مدتوں زبان زد رہی۔ کہتے ہیں کہ ایک سنار شاہی فرمان کی تعمیل میں ایک سونے کا رباب لے کر محل سرا کی طرف جارہا تھا کہ محتسب قاضی نجم الدین اور اس کے آدمی اس پر جھپٹ پڑے۔ انھوں نے اس رباب کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے۔ سنار بیچارہ تکلیف و اذیت میں مبتلا محمود بیگڑھ کے سامنے پہنچا اور محتسب کی اس بیجا مداخلت کے خلاف بڑی فریاد اور آہ و زاری کی۔ مگر حضرت شاہ عالم کے دبدبے کے آگے اپنی عجز و بیچارگی کا مقابلہ کرتے ہوئے جن سے یہ محتسب ایسا سلوک نہیں روا رکھ سکتا تھا۔ سلطان محمود نے کہا کہ ''نیچی بیری سب کوئی جھوڑے۔'' یعنی بیر کے نچلے درخت کو ہر کوئی جھڑجھڑاتا ہے[2]۔

1: داستان تاریخ ادب اُردو۔

2: مقالہ 'گوجری اور اُردو میں اہل گجرات کا حصہ' پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، رسالہ اُردو سہ ماہی کراچی۔ ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء۔

حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کی خوش دامن حضرت بی بی خوند کارنی کے مکاشفے اور مکالمے گجری زبان میں ہیں۔ ان کے کلام کا نمونہ جو ملا ہے وہ یہ ہے۔

جو لک سر پر منہ میت نو لاکھ
نت کھیں باندھ جلایا کوئی نہ آوے ساتھ
جب یہ جیوڑا نکلے کوئی نہ آوے پاس
سب سہیلیاں جور کر شہ دس چالے
کانا بھاگا پریم کا یہ سوتے سوتے جاگے

مذکورہ بالا فقرے نہ تو مربوط نثر کی تعریف میں آتے ہیں اور نہ انھیں باقاعدہ شعر ہی کہہ سکتے ہیں لیکن استخراجی طور پر ہم انھیں نثر پارے کہنے پر مجبور ہیں۔ اس سلسلے کی ترقی یافتہ کڑی حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کے ملفوظات[1] ہیں۔ جن میں گجری یا گجراتی اُردو کے بے شمار جملے ہمیں دستیاب ہوتے ہیں اور قدم قدم پر ہمیں ایسے فقروں سے واسطہ پڑتا ہے جو نہ صرف اس زمانے کی بول چال کے باقیات ہیں بلکہ اُردو کے لسانی ارتقا میں ایک تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ حضرت قطب عالم، شاہ عالم وغیرہ کے جملے فارسی کے اجزا کے نقاب میں چھپے ہوئے تھے لیکن یہاں صاف طور پر کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ اور ان میں کم سے کم ایک مربوط خیال کے

[1] شاہ وجیہہ الدین گجراتی کے ملفوظات کے دو قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ ایک نسخہ وہ ہے جس کے مرتب شیخ محمد اور کاتب بہادر ولد دولت خاں لاہوری ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری، حبیب گنج کلیکشن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں موجود ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے پاس بھی ایک عکسی مخطوطہ ہے جسے موصوف انڈیا آفس لندن سے لائے۔ میں نے دونوں نسخوں کو ملایا تو تقریباً ایک ہی ہیں۔ محض معمولی سا اختلاف ہے۔ غالباً یہی نسخہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کراچی کے پاس بھی ہے۔ دوسرا نسخہ وہ ہے جسے 'بحر الحقائق' کہا جاتا ہے۔ آصفیہ لائبریری حیدرآباد دکن میں ہے۔ اس کی ایک نقل افسر امروہوی کراچی کے پاس بھی ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ اس کا نام کیوں 'بحر الحقائق' رکھ دیا گیا۔ میں نے مولوی عبدالحق کے دیے ہوئے اقتباسات تلاش کیے تو سب اس میں ملے۔ غالباً مولوی صاحب کو اس کی ابتدائی عبارت سے غلط فہمی ہوئی، جو یہ ہے ''ایں چند کلمہ از ملفوظ بحر الحقائق و معدن جواہر اسرار الدقائق، مفتاح کنوز معانی، کاشف اُمور سبحانی شاہ وجیہہ الدین العلوی طاب اللہ ثراہُ و جعل الجنۃ مثواہُ۔'' ظاہر ہے یہ الفاظ تعظیماً لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب کے لیے نہیں لکھے گئے۔ مگر بعد میں یہی نام اس مجموعے کا چل پڑا۔

اظہار کی حد تک فارسی کے سہارے چھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ہمارے نثری آثار میں قدرتی ارتقا کی ایک عجیب صورت نمودار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب 'اُردو کی ترقی میں صوفیائے کرام کا کام' میں حکیم شمس اللہ قادری نے 'اُردوئے قدیم' میں، حامد حسن قادری نے 'داستانِ تاریخِ اُردو' میں، حافظ محمود شیرانی نے اپنے مقالات میں، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے 'اُردو نثر کا آغاز اور ارتقا' میں، ڈاکٹر جمیل جالبی نے 'تاریخ ادبِ اُردو' میں شاہ وجیہہ الدین کے ملفوظات 'بحر الحقائق' سے ان جملوں کو خاص طور سے نقل کیا ہے۔ اور اُردو زبان کی تشکیل و نشوونما کے سلسلے میں ان کی اہمیت پر گفتگو کی ہے۔

شاہ وجیہہ الدین کے ملفوظات کا وہ نسخہ جو علی گڑھ میں دستیاب ہوا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس نسخے میں ایسے اُردو کے جملوں کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے جو نئے اور نادر ہیں اور لسانیات کے محققین کے لیے نہ صرف مزید شواہد کا کام دیں گے بلکہ ان کے ذریعے ایک نئی جہت سامنے آئے گی۔ ملاحظہ ہوں:

(۱) ''می فرمودند نزد ما شریعت وحقیقت است طریقت نیست یعنی تکمیل بطریقت، گفتم چنانکہ آنحضرتؐ ترک بخانۂ دنیاداراں کردہ اند فقیر ہم کند۔ فرمودند: ایا دنیاداراں بیگانہ اند؟ ''دنیاداراں اپنچ ہیں۔''

فرماتے تھے کہ ہمارے نزدیک شریعت اور حقیقت کا اعتبار ہے، طریقت کا نہیں۔ طریقت تو صرف تکمیلِ مدارج کا ذریعہ ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت تو دنیاداروں کے گھر نہ جانے کا عہد کر چکے ہیں تو کیا فقیر بھی ایسا ہی کرے؟ آپ نے فرمایا کیا دنیادار بیگانے لوگ ہیں، آخر وہ بھی تو اپنے ہی ہیں۔

(۲) ''حضرت ایشاں از مجلس درس جدا شدہ بحضرت خضر سخناں می کروند، محرمان ایشاں پرسیدند کہ چہ سخن بود، فرمودند کہ بابا چہ سخن است بغیر از کلام باطن۔ باز استفسار کردند کہ افادہ بود یا استفادہ؟ فرمودند ''ہمیں رسول پاک کے لوگ ہیں۔''

حضرت شاہ صاحب مجلس درس سے جدا ہو کر حضرت خضر سے گفتگو فرما رہے تھے۔ ان

کے ایک واقف کار نے دریافت کیا کہ کیا باتیں ہوئیں؟ فرمایا کہ بابا سوائے کلامِ باطنی کے اور کیا بات ہوگی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ فائدہ دیا گیا یا فائدہ لیا گیا؟ فرمایا کہ ہم رسول پاکؐ کے آدمی ہیں یعنی جو رسولؐ کے فیض سے بہرہ یاب ہوا اُسے کسی اور سے فائدہ لینے کی ضرورت نہیں۔

(۳) ''می فرمودند کہ دست محکم گرفتہ پرسیدم حال گجرات (درقحط چنیں شدہ است ساماں کے خواہد بود۔ بتاکید فرمودند کہ آنرا کہ خدائے تعالیٰ اخفا کردہ است ''ظاہر نہ کیجئے ظاہر نہ کیجئے'' و دست خود از من خلاص کشائندہ رفتند و در مجلس درس حاضر نہ شدند۔''

فرماتے تھے کہ میں نے ہاتھ مضبوط پکڑ کے پوچھا کہ اب گجرات کی حالت ایسی ہوگئی ہے کب سامان ہوگا؟ تاکید کے ساتھ جواب دیا کہ جو بات خدا تعالیٰ نے چھپائی ہے اسے ظاہر نہ کرنا چاہیے اور اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا کر چلے گئے اور پھر مجلس درس میں نہ آئے۔

(۴) ''روزے میاں شیخ صالح خواستند کہ کسب کتابت کنند، فرمودند کہ ما شطاریم ما را از کسب چہ مناسبت است، از ہر جا کہ بگیریم بخوریم و در توحید مستغرق باشیم بفعل زاہدانہ چرا مقید شویم، اگر قوی شبہہ باشد حیلہ کنید و بخورید یعنی از بقال استقراض کنید، پرسیدند کہ اشیاء را اگر مظاہر تصور کنم چون است، فرمودند کہ ''نہ نہ یوں تو ذوق نہ ہووے۔''

ایک دن شیخ صالح نوساروی (مرید) نے آپ سے کتابت کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم لوگ شطاری ہیں، ہم کو کسب سے کیا سروکار۔ جس جگہ سے آوے کھالیں اور توحید میں مستغرق رہیں۔ اگر شبہہ قوی ہو تو شرعی حیلہ کرو اور کھا جاؤ۔ پھر مال مشکوک بنیا کو قرض دے کر لے لو۔ لوگوں نے سوال کیا کہ اگر اشیاء کو ہم مظاہر سمجھ لیں تو کیسا ہے۔ فرمایا نہیں تو اس کو ذوق قبول نہیں کرتا۔

(۵) ''از مختلف الحرمت سوال کردم، فرمودند اتقیاء و علماء اگرچہ خود براں عمل کم کنند اما سلاطین را بر عمل آں فتویٰ دادہ اند۔ باز فرمودند روایت در فقہ یابد چرا نہ کند'' بھونداج ہوئے سو نہ کرے'' یعنی متفق الحرمت نباشد مگر فرمودند

کہ ہر چیزے کہ مہیج ذوق و شوق باشد صوفی آں را ترک نکند۔''

جن اشیاء کے حرام میں اختلاف ہے اس کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ اگرچہ علماء اور متقی لوگ اس پر عمل نہیں کرتے مگر بادشاہوں کے حق میں انھوں نے فتویٰ دے دیا ہے۔ پھر فرمایا کہ جو روایت کہ فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے اس پر کیوں نہ عمل کرے۔ جو چیز بری ہے اس کو نہ کرنا چاہیے یعنی جس کے حرام پر اتفاق ہے۔ پھر شاید فرمایا کہ جس چیز کے متعلق صوفی کا ذوق آمادہ کرے اسے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

(۶) ''فرمودند کہ کسی کہ منکر وحدت وجود باشد او را تصور نقش اللہ و شغل طاقچہ باید فرمود چوں عمل کند'' آپن جھک مار قبول کرے گا۔''

فرماتے تھے کہ جو شخص کہ وحدت الوجود کا منکر ہو اسے اسم ذات کا تصور اور شغل طاقچہ کی فرمائش کرنی چاہیے۔ جب عمل کرے گا تو لامحالہ مان لے گا۔

(۷) ''عزیزے رخصت خواست کہ اگر حکم باشد ہمیشہ روزہ دار باشیم یا اکثر اوقات روزہ داریم، براں اعراض فرمودند و می فرمودند کہ از مغلاں بیاموزید کہ اسپ خور را می خورانند و می دوانند و قوت سہ اربعین شما را کافی است ''تمہاری بلا ریاضت کرے۔''

ایک عزیز نے آپ سے اجازت چاہی کہ اگر حکم ہو تو ہمیشہ ہم روزہ رکھا کریں یا کبھی کبھی روزہ رکھیں؟ پہلے آپ نے اس سے پہلوتہی فرمائی۔ پھر فرمانے لگے کہ مغل سپاہیوں سے سیکھو کہ گھوڑوں کو خوب کھلاتے ہیں اور پھر دوڑاتے ہیں اور تمھیں تین چلے کی قوت بس ہے۔ اس کے بعد تمہاری بلا ریاضت کرنے جائے۔

(۸) ''گفتم بارہا میل می شود کہ ایں قفس تن بشکند فرمودند چرا بشکند ''خاصا پنجرہ ہے۔''

میں نے کہا کہ اکثر خیال میں آتا ہے کہ اس جسم کے پنجرہ کو توڑ دیا جائے۔ فرمایا، کیسے توڑے گا خاصا پنجرہ ہے۔

(۹) ''سَأَلْتُ عَنْ تَفْضِيلِ الْوَلِيِّ عَلَى النَّبِيِّ۔ فرمودند'' کھرے

نادان ہیں کھرے نادان ہیں۔"

میں نے نبی پر ولی کی فضیلت کے بارے میں سوال کیا تو فرمانے لگے ایسا سوچنے والے پکے نادان ہیں۔ کہاں نبی کا مقام اور کہاں ولی۔

(۱۰) "بہ تفضیل انبیاء بر اولیاء فرمودند "رات دن خدا جنوں کی مدح کرے۔"

انبیاء کی اولیاء پر فضیلت کے متعلق ارشاد فرمایا: انبیاء تو وہ ہیں جن کی خدا تعالیٰ رات دن توصیف بیان کرتا ہے۔

(۱۱) "گفتم کسی را کہ کشف خود نمی شود در اعمال چوں اختیار کند، فرمودند کہ استخارہ مسنون کند پس اگر کشف نشود "اپنوں کو کیا فائدہ" یعنی ما را چہ باید کرد کہ ما بکار خود مشغول باشیم کشف کار اوست او داند۔"

میں نے کہا کہ ایک شخص کو کشف نہیں ہوتا تو وہ اعمال میں کیا تدبیر اختیار کرے۔ فرمایا کہ اسے استخارۂ مسنون کرنا چاہیے اور پھر بھی اگر کشف نہ ہو تو ہمیں اس سے کیا غرض، ہم کو تو اپنے کام میں مشغول رہنا چاہیے۔ کشف کرانا اس کا کام ہے وہ جانے۔

(۱۲) "می فرمودند کہ "سب چھوڑ بیٹھے تو شتاب فائدہ ہووے۔" دریک دو اربعین ازاں ہم کم۔"

فرمایا کرتے تھے دنیاوی چیزوں کا خیال ترک کردے اور یکسو ہو جائے تو راہِ سلوک میں جلد فائدہ حاصل ہووے۔ ایک دو چلے بلکہ اس سے کم ہی میں اس کا کام بن جائے گا۔

(۱۳) "می فرمودند کہ مرا طعام و جامہ باید، دیگر حاجت نیست "وہ کیا ہووے جو احمد آباد کے بازار میں" ایں قدر فوطہ بستہ میسر البرکۃ۔"

فرماتے تھے کہ مجھے صرف کھانا کپڑا چاہیے، اور چیزوں کی ضرورت نہیں۔ ان چیزوں کی کیا ضرورت جو احمد آباد کے بازار میں ہیں۔ یہ بندھی ہوئی پیٹی یا کمر بند برکت مہیا کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۱۴) "کسی گفت کہ میاں شیخ محمد فضل اللہ ترک تدریس کردہ اند،

فرمودند کہ "جب ترقی پکڑیں گے آپہین درس کہیں گے۔"

کسی نے کہا کہ میاں شیخ محمد فضل اللہ نے سبق پڑھانا چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا جب علم و عرفان میں ترقی حاصل کریں گے تو خود ہی سبق دیں گے۔

(۱۵) "فرمودند کہ شیخ محی الدین ابن عربی را در امر فرعون مجتہد مخطی گفتند عجب است۔ "اما شیخ عربی کا تقویٰ کہاں میرا امکان کہاں۔"

فرماتے تھے کہ حضرت شیخ ابن عربی کو فرعون کے مومن کہنے پر لوگوں نے غلط اجتہاد کرنے والا انھیں کہا ہے۔ فرمایا ابن عربی کا تقویٰ کہاں، میرا امکان کہاں۔ میں ان کے بارے میں کیا کہوں، شیخ عربی کا تقویٰ کہاں اور میرا منصب کہاں۔

(۱۶) "می فرمودند کہ خلفاء حضرت شاہ عالم گفتند کہ اگر خدمت کنید فائدہ خواہد شد، فرمودند کہ "میری ناحیں کسی کی خدمت کی جاتی۔"

فرماتے تھے کہ حضرت شاہ عالم کے خلفاء نے کہا ہے کہ اگر خدمت کرو گے تو فائدہ ملے گا تو اس پر فرمانے لگے کہ مجھ سے تو کسی کی خدمت نہیں کی جاتی۔

(۱۷) "می فرمودند کہ میاں صالح را پرسیدند کہ شما شراب می خورید گفتند آری۔ فرمودند "اولیا کیا صفتاں ہوتیاں ہیں۔"

فرماتے تھے کہ میاں صالح نوساروی سے پوچھا گیا کہ آپ لوگ شراب (معرفت) پیتے ہیں۔ کہنے لگے کہ ہاں، فرمایا کہ اولیاء اللہ کی کیا خوبیاں ہوتی ہیں۔

(۱۸) "کسی از بندہ قرض می خواست یک ہون یا دو ہون۔ حضرت میاں عبد اللہ (پسر شیخ وجیہہ الدین) مائل بریں بود کہ پر تاب بدہند۔ فرمودند "تمہیں ایہاں رہتے ہو۔" یعنی با اہلِ محلّہ خود بے مروّتی نباید کرد۔

ایک شخص نے خاکسار سے ایک ہون یا دو ہون (نام سکہ) بطور قرض کے طلب کیا۔ شاہ صاحب کے صاحبزادے میاں عبد اللہ مروّت کے خیال سے چاہتے تھے کہ جلد دے دیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تم لوگ یہاں رہتے ہو، اپنے محلّہ والوں کے ساتھ بے مروّتی نہ کرنی چاہیے۔

(۱۹) "در آغاز صحبت چوں زیادہ ادب از بندہ دیدند فرمودند کسی تعظیم

من نکند و من ہم تعظیم نکنم ۔ عزیزی شاید عطا محمد در وقت موت آں حضرت را طلب می کردند، فرمودند ''ہوں مروں تو بھی کوئی نہ آ دوے'' از تواضع مفرط و تکبر خالی بودند۔''

ابتدائے صحبت میں جب کسی کی جانب سے بہت زیادہ ادب و تعظیم دیکھتے تو فرماتے تھے کہ کوئی میری تعظیم نہ بجالائے، اور میں بھی تعظیم نہ کروں گا۔ ایک عزیز غالباً عطا محمد نے موت کے وقت حضرت کو بلوایا تو فرمانے لگے کہ میں اگر مرنے لگوں تو بھی میرے پاس کسی کو آنے کی ضرورت نہیں۔ خاکساری حد سے زیادہ تھی اور تکبر و گھمنڈ سے بالکل خالی تھے۔

(۲۰) ''شکوہ کردم نقصان عقلی را۔ فقال ''مینجھ تھی اَدَی عقل ہے۔''

میں نے عقل کی کمی کی شکایت کی تو فرمایا کیا مجھے زیادہ عقل ہے۔

(۲۱) ''می فرمودند'' تقوئی جھوت جاتا'' غیر مرتب یعنی بعد از فتح باطن در تقوئی ظاہری بے اختیار نقصان واقع می شود، لَعَلَّ هٰذَا كَانَ حَالَهُ لَا قالَهُ''

فرماتے تھے تقوئی باقی نہیں رہتا۔ اس میں خلل واقع ہو جاتا ہے یعنی جب باطنی احوال میں کشادگی پیدا ہوتی ہے تو ظاہری تقوئی میں کمی آ جاتی ہے۔ شاید یہ حال کی بنا پر کہا نہ کہ قال کی بنا پر۔

(۲۲) ''از قبول استدعائے مہمانی سوال و گفتم کہ تفرقہ می دہد۔

فرمودند'' فقیر پر فرض تو نہیں۔''

دعوت قبول کرنے کے بارے میں سوال کیا اور میں نے عرض کیا کہ اس سے طبیعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے تو فرمایا'' فقیر پر اس کی قبولیت فرض تو نہیں ہے۔''

(۲۳) ''میاں صبغۃ اللہ بھڑوچی مسودۂ حاشیۂ شرح ملا کہ شیخ وجیہہ الدین نوشتہ بودند از من گرفتند و فرمودند کہ ''یوں چلیو جیو۔''

حضرت شیخ وجیہہ الدین کا حاشیہ شرح ملا میاں صبغۃ اللہ بھڑوچی نے جھپٹ کر لے لیا تو فرمایا کہ دیکھو اس طرح ہونا چاہیے۔

یہ جملے اور فقرے ہم نے ملفوظات مرتبہ شیخ محمد سے پیش کیے۔ اس کے علاوہ 'بحر الحقائق' کے نام سے آپ کا جو مجموعۂ ملفوظات مشہور ہو گیا ہے اس میں بھی جگہ جگہ ہندی اور گجری میں شیخ کے اقوال درج ہیں۔ شیخ کے مریدان سے سوال کرتے ہیں تو فارسی کے ساتھ اُردو گجری جملوں میں بھی وہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ مولوی عبدالحق اور دیگر حضرات نے انہی جملوں کو نقل کیا ہے۔

(۲۴) لفظ۔ فرمودند کہ ''جس چیز میں ذوق و شوق پاوے اسے ترک نہ دیوے۔'' یعنی دراں چیزے کہ صوفی ذوق و شوق یابد آنرا ترک ندہد۔

(۲۵) شخصے گفت اگر آں چیز متفق الحرمت باشد چہ کند؟ از و اعراض نمودہ فرمودند'' بھونڈا ہووے سو نہ کرے۔''

(۲۶) لفظ۔ عزیزے عرض کرد بخانۂ دنیاداراں نروم۔ فرمودند'' کا ہے دنیادار بھی انچ ہیں۔'' یعنی اہل دنیا نیز از ماأند۔

(۲۷) لفظ می فرمودند'' طالب کشف نباید شد۔ اپنوں کوں کیا کشف ہووے یا نہ ہووے کام اس کا ہے۔''

(۲۸) ''در کایت کردن فرمودند'' کیا ہوا جو بھوکوں موا بھوکوں موئے تیں کیا خدا انپڑیا خدا کو انپڑنے کی استعدد ہور۔''

(۲۹) لفظ کسی از ریاضت عرض کرد۔ فرمودند'' میں کہاں یا کدھاں ریاضت کیتی۔''

(۳۰) لفظ فرمودند۔'' جیسی تجلی پکڑے تیسا ارادہ دیوے۔ اگر عبد کی تجلی پکڑے عبدیت ارادہ دیوے۔''

(۳۱) عزیزے التماس کرد کہ اگر اجازت شود اربعین نشینم، فرمودند'' اس میں ہور کیا خوب ہے، اس دنیا میں کہ دل خدا سوں مشغول ہووے۔''

(۳۲) شخصے عرض کرد کہ عارف کرا گویند۔ فرمودند'' عارف اسے کہویں جو خدا سوں بھریا ہووے۔''

(۳۳) آپ کا ایک مقولہ ہے کہ'' اگر کسی کوں تھوڑی بھی صفا ہووے جو حرام لقمہ کھاوے یا حرام فعل کرے تبیج (اسی وقت) دوجے (دوسری) بار بھی پاوے۔ تیجے (تیسری) بار بھی

پادے۔''

شاہ وجیہہ الدین کے انھی فقروں کو ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب 'تاریخ ادب اُردو' میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان ملفوظات اور فقروں کا اگر نویں صدی ہجری کے ملفوظات اور فقروں سے مقابلہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ دسویں صدی ہجری میں زبان نسبتاً صاف ہوگئی ہے۔ دوسری زبانوں کے اثرات یا تو اُردو زبان کا حصہ بن گئے ہیں یا پھر اُردو زبان کے نئے معیاری کینڈے سے خارج ہوگئے ہیں۔ قطب عالم اور شاہ عالم کے ملفوظات میں جو اکھڑا اکھڑا پن ہے، وہ شاہ وجیہہ الدین علوی کے ملفوظات میں نہیں ملتا۔ یہاں مقابلتاً شائستگی، نرمی اور گھلاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس عرصے میں زبان ڈھل منجھ کر اتنی ضرور نکھر گئی ہے کہ اب اسے زیادہ مؤثر طریقے سے استعمال میں لایا جاسکے۔ ایک خاص اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ دکنی اُردو کے اثرات بھی شاہ صاحب کی زبان پر رچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً اچھے ہیں (ہم ہی ہیں) میں چ...... ہے، دکنی اُردو میں مرہٹی سے آئی اور گجرات میں بھی جزوِ زبان بن گئی۔ اسی طرح 'ولیوں کیا صفتاں ہوتیاں ہیں' میں پنجابی اثرات جو دکنی اُردو میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں، گجراتی اُردو کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ دسویں صدی ہجری اس اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مختلف زبانیں، مختلف لہجے، مختلف اصول و قواعد، ایک جان ہوکر اپنی ایک الگ شکل بنا لیتے ہیں۔ شاہ وجیہہ الدین علوی کی زبان شمال، دکن اور گجرات کی زبان کو اپنے دامن میں اسی سطح پر سمیٹ لیتی ہے اور یہی ان کے ملفوظات کی تاریخی اہمیت ہے[1]۔''

☆☆☆

[1] تاریخ ادب اُردو، جلد اوّل، ص: ۱۰۱۔

فارسی اشعار

حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی شاعر بھی تھے۔ کبھی کبھی تفننِ طبع کے لیے شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں والہانہ اور صوفیانہ رنگ ہے۔ تخلص وجہی ہے۔ انھوں نے کوئی دیوان نہیں چھوڑا لیکن ان کے بعض مریدوں نے اپنی بیاضوں میں قلمبند کرلیا تھا اور وہی سینہ بسینہ ہوکر لوگوں تک پہنچے۔ نواب سیّد علی حسن خاں نے 'صبح گلشن' میں دو شعر نقل کیے ہیں:

زاہدے کز نمودش بر زمیں رحمت فرو ریزد   چو بر کشت محبت بگذرد محنت فرو ریزد
زبستانم کہ باشد آرزویم میوۂ رافت   زنخلِ او بداماں طلب آفت فرو ریزد

مولانا سیّد ابوظفر ندوی نے اپنے مقالہ مندرجہ معارف میں متفرق بیاضوں سے ذیل کے اشعار دیے ہیں:

کے بگرد ما رسد ہر صعوۂ   شاہباز عرش پروازیم ما
سرّ وحدت را زبانِ دیگر است   با مسیح و خضر ہمرازیم ما

سر دہم در گریہ چشم اشکبار خویش را   بر کنم از لخت دل ہر دم کنار خویش را
دل اگر بیگانہ شد از بے وفا بر ما چہ جرم   آدمی نشناسد ار پروردگار خویش را
تا رسد بر سر کوئے تو گردِ من نسیم   در رہِ باد صبا زنم غبار خویش را

کتابیات

اس کتاب کی تیاری میں حضرت شاہ وجیہ الدین علوی کی قلمی تصنیفات و ملفوظات کے علاوہ اور جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

عربی:

۱۔ ظفر الواله بمظفر و آله، محمد بن عمر آصفی مرتبه سر ڈینی سن راس. مطبوعه لندن

۲۔ النور السافر فی اخبار قرن العاشر، عبد القادر حضرمی، مخطوطہ حبیب گنج کلیکشن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ

۳۔ سبحة المرجان فی آثار هندوستان، غلام علی آزاد بلگرامی، مطبوعہ بمبئی، ۱۸۸۵ء

۴۔ ابجد العلوم، نواب صديق حسن، مطبوعہ بھوپال، ۱۸۷۸ء

۵۔ نزهة الخواطر و بهجة المسامع و النواظر، مولانا سیّد عبد الحی حسنی، مطبوعہ حیدرآباد

۶۔ الاعلام قاموس تراجم لأشهر الرجال و النساء من العرب و المستعربين و المستشرقين، خير الدين الزركلی، مطبوعہ مصر

۷۔ الثقافة الاسلامیه فی الهند، مولانا سیّد عبد الحی حسنی، مطبوعہ دمشق، ۱۹۸۵ء

فارسی

۸۔ مآثر الکرام، غلام علی آزاد بلگرامی، مفید عام آگرہ

۹۔ گلزار ابرار قلمی، محمد حسن غوثی، مملوکہ ڈاکٹر سید محمد فرید برہانپوری

۱۰۔ خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۸۷۳ء

۱۱۔ سفینۃ الاولیاء، دارا شکوہ، مطبوعہ کانپور، ۱۸۸۴ء

۱۲۔ تذکرہ علمائے ہند، رحمان علی، نول کشور لکھنؤ، ۱۹۱۴ء

۱۳۔ اخبار الاخیار، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۰۹ھ

۱۴۔ اقبال نامہ جہانگیر، جلد سوم، معتمد خاں، مخطوطہ حبیب گنج کلیکشن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ

۱۵۔ طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین احمد بخشی، مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

۱۶۔ منتخب التواریخ، ملا عبد القادر بدایونی، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، ۱۸۶۷ء

۱۷۔ طبقات شاہجہانی، ملا محمد صادق، مخطوطہ حبیب گنج کلیکشن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ

۱۸۔ معارج الولایت قلمی، جلد دوم، غلام معین الدین، مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۹۔ مآثر رحیمی، ملا عبد الباقی نہاوندی، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۲۴ء

۲۰۔ مفتاح التواریخ، مرتبہ طامس ولیم بیل، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، ۱۸۴۷ء

۲۱۔ مشکوٰۃ النبوت، علی محمد موسوی، مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد دکن

۲۲۔ تقصار جيود الاحرار من تذكار جنود الابرار، نواب صدیق خاں، مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۲۹۸ھ

۲۳۔ بحر زخار، وجیہ الدین بن محمد یوسف، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ

۲۴۔ تزک جہانگیری، مرتبہ سر سید احمد خاں، مطبوعہ علی گڑھ

۲۵۔ آئین اکبری، ابو الفضل، مرتبہ سر سید احمد خاں، علی گڑھ

۲۶۔ مآثر الامراء، جلد دوم، صمصام الدولہ شاہنواز خاں، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۹۱ء

۲۷۔ صبح گلشن، نواب سید علی حسن خاں، مطبع شاہجہانی، بھوپال

۲۸۔ جامع الغموض منبع الفیوض، عبد النبی احمد نگری، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، ۱۹۱۶ء

۲۹۔ مرآۃ احمدی، مرزا محمد حسن، مطبوعہ سیواجی راؤ یونیورسٹی، بڑودہ

۳۰۔ مرآۃ سکندری، سکندر بن محمد، مطبوعہ بمبئی، ۱۸۳۱ء

۳۱۔ مجموعہ حالات شاہ وجیہ الدین علوی، مرتبہ محمد یوسف کھٹ کھٹے، مطبوعہ بمبئی

اُردو

۳۲۔ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار، ترجمہ فضل احمد، مطبوعہ ۱۹۰۸ء

۳۳۔ منتخب التواریخ، ترجمہ محمود فاروقی، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۳ء

۳۴۔ تزک جہانگیر مترجمہ، سید احمد علی رامپوری، مطبوعہ لاہور

۳۵۔ مرآۃ احمدی، حصہ سوم، ترجمہ مولانا سید ابو ظفر ندوی، مطبعہ حمایت اسلام، لاہور، ۱۹۳۴ء

۳۶۔ روضۃ الاولیاء بیجاپور، مصنفہ محمد ابراہیم، ترجمہ سیف اللہ قادری، مطبوعہ رائچور، ۱۳۱۴ھ

۳۷۔ محبوب ذی المنن تذکرہ اولیائے دکن، عبد الجبار ملکاپوری، مطبوعہ حیدرآباد

۳۸۔ یاد ایام، مولانا سید عبد الحئی حسنی، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۱۹ء

۳۹۔ اُردو کی نشو و نما میں صوفیاء کرام کا کام، مولوی عبد الحق، مطبوعہ کراچی، ۱۹۵۳ء

۴۰۔ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، مطبوعہ لاہور

۴۱۔ مرآۃ محمدی، شیخ غلام محمد، مطبوعہ بمبئی، ۱۳۳۲ھ

۴۲۔ حدائق الحنفیہ، فقیر محمد جہلمی، مطبوعہ نول کشور، ۱۸۸۶ء

۴۳۔ حیات عبد الحق، پروفیسر خلیق احمد نظامی، مطبوعہ دہلی، ۱۹۶۴ء

۴۴۔ شاہ محمد غوث، پروفیسر مسعود احمد، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء

۴۵۔ برکات الاولیاء، سید امام الدین گلشن آبادی، افضل المطابع، دہلی، ۱۳۲۲ھ

مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی



مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی اعظم گڑھ سے قریب سُیدھا-سلطان پورؔ میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ الاصلاح سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ان کے والد خود مدرسۃ الاصلاح کے بانیوں میں سے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے لاہور چلے گئے اور علم وادب کی سیاحی کرتے ہوئے انھوں نے مشہور شاعر احسان دانش کے اشتراک سے مومن خان مومنؔ پر کتاب شائع کی۔ بعد میں وہ اپنے وطنِ مالوف لوٹے اور پھر بمبئی کا رُخ کیا۔ بمبئی، اُردو تعلیم کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں پر انھوں نے انجمن اسلام کے مشہور اسکول، احمد سیلر ہائی اسکول میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور عربی اور اُردو کی تعلیم میں مصروف ہوگئے۔ انھیں ادبی اور علمی تحقیق سے گہرا شغف تھا۔ بمبئی شہر میں اصلاحی صاحب کو اپنے ذوق کی آبیاری کا بھرپور موقع ملا اور درس و تدریس کے ساتھ انھوں نے مشہور صوفی حضرت مخدوم علی مہائمیؒ پر اعلیٰ پایہ کی کتاب تصنیف کی۔ **'حضرت مخدوم علی مہائمیؒ: احوال و آثار'** ان کا اعلیٰ پائے کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ وہ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر اور لائبریری (ہندوستانی پرچار سبھا) میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ مولانا پرواز اصلاحی نے اپنے قیامِ بمبئی کے زمانے میں ایک اور کتاب معاصرِ غالب **'مولانا صدرالدین آزردہ: احوال و آثار'** بھی تصنیف کی۔ مہاتما گاندھی میموریل میں فیلوشپ کے دوران انھوں نے گجرات کے مشہور صوفی شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ پر محققانہ کتاب تصنیف کی۔ ۷۸-۱۹۷۷ء میں وہ اپنی علالت کی وجہ سے بحیثیت فیلو دارالمصنّفین (اعظم گڑھ) میں منتقل ہوئے اور ایک علمی پروجیکٹ پر کام شروع کیا۔ افسوس کہ وہ مکمل نہیں ہوسکا۔ قیامِ بمبئی کے دوران انھوں نے مہاراشٹر کے صوفیاء پر بھی کام شروع کیا تھا جس کی چند قسطیں ماہنامہ نقشِ کوکن میں شائع ہوئی تھیں۔ مولانا پرواز اصلاحی اعلیٰ پائے کے محقق اور صوفیانہ طبیعت کے مالک تھے۔ ۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو ان کا انتقال ہوا اور سُیدھا-سلطان پورؔ میں تدفین عمل میں آئی۔

پروفیسر عبدالستار دلوی
ڈائرکٹر، انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۴۶۔ گجرات کی تمدنی تاریخ، مولانا سید ابوظفر ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ
۴۷۔ اُردوئے قدیم، حکیم شمس اللہ قادری، مطبع نول کشور، ۱۹۲۵ء
۴۸۔ داستان تاریخ اُردو، حامد حسن قادری، مطبوعہ آگرہ ۱۹۶۶ء
۴۹۔ تاریخ ادب اُردو جلد اوّل، ڈاکٹر سید جمیل جالبی، مطبوعہ دہلی، ۱۹۷۷ء
۵۰۔ تذکرہ، مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ کلکتہ
۵۱۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی، مولانا محمد میاں، مطبوعہ دہلی
۵۲۔ اُردو نثر کا آغاز وارتقا، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، مطبوعہ حیدرآباد
۵۳۔ مقالات حافظ محمود شیرانی، مطبوعہ لاہور
۵۴۔ اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، مولانا سید عبدالحی حسنی، ترجمہ مولانا ابوالعرفان ندوی، اعظم گڑھ
۵۵۔ شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا، مطبوعہ لاہور
۵۶۔ کلیاتِ ولی، ولی دکنی، احسن مارہروی، انجمن ترقی اُردو ہند

رسائل:

۵۷۔ رسالہ اُردو سہ ماہی، کراچی، جنوری ۱۹۵۱ء و اکتوبر ۱۹۵۰ء
۵۸۔ معارف اعظم گڑھ، فروری-مارچ-اپریل ۱۹۳۳ء، ماہ جون ۱۹۵۰-فروری ۱۹۶۳ء
۵۹۔ نوائے ادب بمبئی، جنوری ۱۹۵۱ء، جولائی ۱۹۵۷ء

گجراتی کتب:

۶۰۔ سوانح حضرت شاہ وجیہ الدین، چندر پرمار، مطبوعہ احمد آباد
۶۱۔ گلزار وجیہ یعنی جیون چرتر شاہ وجیہ الدین، حافظ محمد اسماعیل بھڑوچ، گجرات

انگریزی

62. Encyclopaedia of Religion and Ethics, Vol. XI by T.W. Arnold.
63. Element of the Science of Language, 2nd Edition.
64. The Origin and Development of the Bengali Language by Dr. Suniti Kumar Chaterjee.